میں اب یہ سوچا کرتا ہوں "ما و رچہ خیالیم و فلک در چہ خیال" کیا غلط تصور مستقبل کے متعلق تھا۔

۱۳ مارچ ۱۹۴۲ء کو غلام محمد مرحوم حیدرآباد پہنچے۔ اُن سے یہ معلوم ہوا کہ سید عبدالعزیز صاحب مرحوم نے دہلی میں یہ مشہور کیا ہے کہ حیدرآباد میں۔ میں بہت غیر ہر دلعزیز ہوں۔ میں غلام محمد صاحب کو وہاں کے حالات کے متعلق بتاتا رہا اور غلام محمد صاحب کے تقرر کے لئے حضور نظام کو عرضداشت لکھ کر بھیجدی۔

۱۶ مارچ ۱۹۴۲ء کو پھر کاظم یار جنگ آئے منجملہ بہت سے احکامات کے یہ بھی حکم تھا کہ حیدرآباد کے حقوق کے متعلق ایک نوٹ تیار کیا جائے اور اس وقت موقعہ ہے آزادی کے حصول کی کوشش کی جائے اور اس سلسلہ میں نواب بہادر یار جنگ مرحوم کے ذریعہ پبلک میں ایجیٹیشن کرایا جا سکتا ہے میں نے اس سے اختلاف کیا اور کاظم یار جنگ سے کہا کہ ایسا کرنا خلاف مصلحت ہوگا۔

نواب بہادر یار جنگ مرحوم

یہ ایک جاگیردار تھے اور پبلک لیڈر تھے۔ ان کا نام بہادر خاں تھا۔ اردو کی تقریر بہت اچھی ہوتی تھی۔ حیدرآباد کی ریاست میں ان سے بہتر اردو مقرر نہ تھا۔ یہ اتحاد المسلمین کے صدر بلکہ اس کے بانی تھے۔ حیدرآباد میں عام طور پر اور خاص کر مسلمانوں پر ان کا بہت اثر تھا۔ گو زمانہ حال کے معیار سے ان کی علمی قابلیت کچھ زیادہ نہ تھی۔ مگر باری تعالیٰ نے انہیں عقل عام (COMMON SENSE) سے نوازا تھا۔ بغیر علمی قابلیت بیکار رہتی ہے بلکہ علمی قابلیت بغیر عقل عام بعض وقت خطرناک ہو جاتی ہے۔

ایک بار دوران گفتگو میں مجھ سے فرمایا کہ سر اکبر حیدری مرحوم کے

زمانہ میں اس کی ابتدا ہوئی۔ ممکن ہے اس زمانہ میں آریہ سماج نے ایجیٹیشن کیا تھا اور یہ اُس کا ردِ عمل ہو بہادر یار جنگ نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ سر اکبر مرحوم نے اُنہیں کسی دوسرے نام سے چالیس یا پچاس ہزار روپیہ بھی اس کام کے واسطے دیا تھا۔ میرے خیال میں یہ غلطی تھی۔ حکمراں جماعت کے واسطے جداگانہ تنظیم مفید نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ سے لوگوں کی وفاداری پر اثر پڑتا ہے اور ہر گورنمنٹ کو کوشش کرنی چاہئے کہ اُسے ہر جماعت کا اعتماد حاصل ہو سکے۔ معترض ہونا دوسری بات ہے اعتراض کرنے کا حق سب کو ہے۔ لیکن وفاداری متاثر ہونا بالکل اور چیز ہے۔

مجھے نواب صدر یار جنگ سے یہ معلوم ہوا کہ جاپان کے بڑھتے ہوئے سیلاب کی وجہ سے برٹش گورنمنٹ کو یہ اندیشہ ہے کہ برما پر تو جاپان کا قبضہ ہو گیا اور ممکن ہے کہ جنگی جہازوں کے ذریعہ مدراس کے ساحل پر جاپانی فوجیں آ جائیں۔ اس لئے برٹش گورنمنٹ کو یہ اختیار ہونا چاہئے کہ جب چاہے "مارشل لاء" لگا دے۔

مجھے اس کے متعلق کوئی علم نہ تھا۔ صرف اتنا معلوم تھا کہ اس روز ایک میٹنگ ریزیڈنٹ کے ہاں ہوئی تھی تاکہ اگر حملہ ہو تو عوام کو بچاؤ کے واسطے کیا کرنا چاہئے اس پر غور کیا جائے وہاں دوران گفتگو میں یہ معلوم ہوا کہ مدراس کے کنارے پر ایسے لوگ مامور کئے گئے ہیں کہ جو سائیکل لئے ہوئے رہتے ہیں کہ اگر کوئی ہوائی یا سمندری جہاز دشمن کا نظر آئے تو فوراً اطلاع دیں۔ بعض لوگوں کو دس یا پندرہ میل سائیکل پر سفر کرنا ہوگا تب وہ فون کر سکیں گے۔ میں نے کہا کہ اس سے کیا فائدہ ہوگا یہ خبریں تو "بم باری" کے بعد پہنچیں گی۔ طے پایا کہ انہیں ٹرانسمیٹر دیئے جائیں تاکہ فوراً خبر کر سکیں۔ ایک ریزیڈنٹ نے کہا کہ برٹش حکومت کو یہ اختیار ہونا چاہئے کہ جب چاہیں ریاست کے رقبہ میں مارشل لاء جاری کر دیں اور اختیارات

جنوبی کمانڈ کو دیدیا۔ میں نے کہا جب آپ کہیں گے "مارشل لاء" جاری کر دینگے
آپ یہ اختیار کیوں لینا چاہتے ہیں۔ وہ کہنے لگے کہ حملہ ہو جانے پر صلاح
مشورہ ناممکن ہے۔ میں نے کہا کہ حملہ کے بعد تو ایک مختلف ذہنیت پیدا
ہو جائے گی لیکن اگر آج ایسا کیا جائے گا تو لوگوں میں پریشانی پھیلیگی
اور گھبرا جائیں گے۔ انہوں نے مان لیا۔ کسی فوجی جنرل کو "مارشل لاء" کا
اختیار دینا غلطی ہے۔

گھر آکر مجھے خاص وحشت ہو گئی کہ اگر جاپانی فوجیں مدراس پر آگئیں
تو پورا جنوبی ہندوستان خطرے میں آ جائیگا۔

۱۰ مارچ کو ملاقات کے موقعہ پر میں نے اعلیٰ حضرت سے عرض کیا
کہ اس زمانہ میں کوئی شورش بہادر یار جنگ کے ذریعہ سے کرانا مناسب نہ
ہوگا۔ اول تو انگریز یہ سمجھے گا کہ میری پریشانی سے بیجا نفع اٹھانا چاہتے
ہیں اور چونکہ شورش فقط مسلمان کر رہے ہونگے تو سارے ملک کی تحریک
نہیں سمجھی جائے گی اور ممکن ہے کہ ہندو صاحبان اس کے خلاف شورش
کریں۔ مگر نظام یہی کہتے رہے کہ انگریز بغیر شورش کے کچھ نہ دیں گے۔

دوسرے روز جو میں حاضر ہوا تو حضور نظام نے یہ فرمایا کہ ابوالحسن
سید علی (جو اتحاد کے ایک رکن تھے) نے یہ لکھا ہے کہ مسلمانان حیدرآباد
کو میری گورنمنٹ پر اعتماد نہیں ہے اس لئے کہ اہم امور میں میری گورنمنٹ کچھ
نہیں کرتی۔ اہم امور سے منشا ہز مجسٹی کا خطاب۔ برار کی واپسی وغیرہ تھا۔ اس
حالت میں وہ شورش کرنے پر آمادہ ہیں اسے جب سرکار نے بار بار دہرایا تو
مجھے کہنا پڑا کہ فدوی نے تو جس روز تقرر ہوا تھا عرض کر دیا تھا کہ تقرر تھوڑے
ہی روز کے واسطے ہو لیکن حضور جس روز چاہیں گے میں چلا جاؤں گا یہ
بات ختم ہو گئی۔

۲۰ مارچ ۱۹۴۲ء کو بہادر یار جنگ میرے پاس آئے کہنے لگے

سے شکوہ کیا کہ ابوالحسن سید علی نے اتحاد المسلمین کی طرف سے اس قسم کا خط
سرکار کو بھیجا ان سے معلوم ہوا کہ سرکار کا ایک فرمان ابوالحسن کے پاس آیا
تھا جس میں حیدرآباد کے حقوق کے متعلق ذکر تھا۔ ہم نے جواباً یہ عرض کیا
کہ سرکار ان چیزوں سے ہمیں الگ رکھیں ورنہ دشواریاں پیدا ہونگی ہم
اپنا فرض ادا کریں گے جس طرح بہتر ہوگا۔

سر اسٹیفورڈ کرپس کی آمد

ان کی آمد نے نہ صرف والیان ملک میں بلکہ کانگریس، لیگ اور مختلف
سیاسی جماعتوں میں ہیجان پیدا کر دیا۔ میں ان سے پہلے بھی سر تیج بہادر سپرو
کے گھر شاید ۱۹۲۳ء یا ۱۹۲۴ء میں ملا تھا۔ یہ ہندوستان کی آزادی کے
علمبردار تھے مزدور پارٹی کے قائدین میں سے ایک تھے۔ نہایت ذہین صاحب
علم اور مردم شناس شخصیت کے حامل تھے۔ اسی کے ساتھ بہت اچھے
مقرر تھے جتنی تجاویز لائے تھے وہ سب ایسی تھیں کہ ہر فریق اس کے
اپنے حسب منشا سمجھتا تھا۔ والیان ملک اور ان کے وزراء عجیب
کشمکش میں تھے۔ ایک جانب تو یہ اس سے خوش تھے کہ آئندہ حکومت
میں ریذیڈنٹ کا دخل نہیں رہے گا۔ لیکن یہ نہ وزراء کی سمجھ میں آتا تھا
نہ والیان ملک کی کہ جمہوری آزاد ہندوستانی گورنمنٹ کے ساتھ
ان کی شخصی حکمرانی کا جوڑ کیسے ملے گا۔ امن قیام کی ذمہ دار تو برٹش گورنمنٹ
تھی کوئی پرنس یہ خیال نہیں کرتا تھا کہ اس کے ہٹنے کے بعد کیا ہوگا۔ مجھے
یقین ہے کہ اگر برٹش حکومت معاہدوں کی وجہ سے والیان ملک کی
حفاظت کی ذمہ داری نہ لیتی تو ان میں سے بعض ریاستیں ختم ہو گئی ہوتیں
دوسری جانب بعض ایسی ریاستیں بھی تھیں کہ اگر برٹش اتالیق ہوتے
تو وہ پوری طور پر مفلوج نہ ہو جاتیں اور اپنی رعایا سے بے تعلق ہو جانا
ان کی اصل کمزوری تھی۔

٩٣

تقاضوں سے برٹش حکومت پوری طرح متاثر ہو گئی تھی۔
میں خود ان حالات سے بے خبر تھا۔ جنگ کے ایک طرف تو برٹش حکومت کمزور ہو گئی تھی دوسری جانب اقوام عالم میں آزادی اور خود اختیاری کی لہر دوڑ رہی تھی۔ امریکہ برابر انگلستان پر دباؤ ڈال رہا تھا کہ ہندوستان کو آزاد کیا جائے ان تمام عوامل سے برطانوی پالیسی متاثر ہو رہی تھی۔ اس کا مجھے ذاتی علم تھا کہ امریکہ ہندوستان کی آزادی کا طرفدار تھا۔ اس زمانہ میں دہلی میں مسٹر ولیم فلپ مقیم تھے۔ یہ امریکہ کے پریسیڈنٹ مسٹر روزویلٹ کے ذاتی نمائندہ کی حیثیت سے یہاں تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے حیدرآباد آنے کا قصد ظاہر کیا۔ میں نے خوشی سے منظور کیا وہ حیدرآباد آ کر میرے ہی پاس ٹھیرے حالانکہ برٹش ریزیڈنٹ نے کوشش کی کہ وہ ریزیڈنسی میں قیام کریں۔ ہندوستان کے سیاسی حالات پر گفتگو کے دوران میں انہوں نے مجھ سے کہا کہ امریکہ کے پریسیڈنٹ نے مسٹر چرچل کو اس طرف متوجہ کیا تھا کہ مناسب ہوگا کہ ہندوستان کو آزاد حکومت دیجائے۔

اسی زمانہ میں ایک روز نواب بہادر یار جنگ اور ابوالحسن سید علی مرحوم مجھ سے دہلی میں ملے اور کہا کہ سرکار کے حکم سے وہ آئے ہیں کہ ہم لوگوں کو مدد دیں اور مسلمان لیڈروں سے مل کر انہیں حیدرآباد سے موافقت کے لئے تیار کریں۔ میں مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ مدد تو کیا کرتے البتہ پرچہ نویسی کا کام کر سکتے تھے۔ یہ اسی زمانہ میں شاہان وقت ایسے ذرائع سے خبریں حاصل کیا کرتے تھے مگر اس زمانہ میں ایسے حضرات کا مشورہ کہ جو اس مشورہ کے نتائج کے ذمہ دار نہ ہوں یقیناً خطرناک تھا۔

سر اسٹیفرڈ کرپس کے آنے اور ان کی پالیسی کو حکومت ...

٩٤

سے پسند نہ کرتی تھی اس کا اظہار بعض ایگزیکیٹو کونسلر اور پولیٹیکل صیغہ کے افسران سے صاف ظاہر ہوتا تھا۔

۲۸ مارچ ۱۹۴۲ء کو ہماری پہلی ملاقات سر اسٹیفرڈ سے ہوئی۔ اپنے تاثرات کے اظہار کے لئے اپنے روزنامہ سے کچھ اقتباسات نقل کرتا ہوں تاکہ اس زمانہ کی ذہنی کیفیات کی پوری تصویر سامنے آجائے۔

۲۸ مارچ ۱۹۴۲ء سر اسٹیفرڈ ہم لوگوں کو سیڑھیوں تک لینے آئے نہایت اخلاق سے ہم لوگوں کو بٹھایا۔ یہ نہایت ذہین طبع اور حاضر جواب آدمی ہیں۔ دبلے پتلے ہیں۔ کپڑے اچھے پہننے کا شوق ہے۔ سیاسی (ڈپلومیٹک) کام کے لئے مخصوص صلاحیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تجویز ہم لوگوں کو دی۔ اس تجویز کے متعلق میری رائے ہے کہ یہ چند بنیادی اصول ہیں جن کو اس طرح تیار کئے ہیں کہ ہر فریق ان میں سے اپنے مزاج کے موافق مطلب نکالے لیکن جب ان تجاویز کو ایک اسکیم کی شکل دیجائیگی تو مکمل تصویر تیار ہوگی۔ اس وقت غالباً ہر طبقہ کو بالخصوص مسلمانوں اور والیان ملک کو بڑی ناامیدی ہوگی۔ ہمارے وفد میں۔ جام صاحب نواب بھوپال۔ پٹیالہ۔ سروہی۔ اور سر سی پی راماسوامی۔ گوپالا سوامی آئنگر وغیرہ اور میں شامل تھے۔

میں نے فقط دو سوالات کئے۔

(۱) جب صوبوں کو یہ حق ہے کہ جس یونین میں چاہیں شریک ہوں تو کیا یہی حق ریاستوں کو بھی ہوگا" سر اسٹیفرڈ نے کہا "ہاں"۔
میں نے کہا کہ اگر کچھ ریاستیں خود ملکر یونین بنائیں تو کیا انہیں اسکا حق ہوگا" سر اسٹیفرڈ نے کہا "نہیں"۔
اس پر جام صاحب نے کہا کہ کیا ہمیں اتنا بھی حق نہ دیا جائے گا جو صوبجاتی حکومتوں کو دیا جا رہا ہے" سر اسٹیفرڈ نے کہا کہ کوئی

وجہ نہیں اگر بہت سی ریاستیں ملکر ایک یونین بنائیں تو کیوں نہ اُسے مان لیا جائے۔ لیکن جب والیان ملک نے بذریعہ تحریر اُنہیں پابند کرنا چاہا تو سر اسٹیفرڈ نے کہا کہ ریاستوں کو کوئی حق دوسری یونین کا ساحاصل نہ ہوگا۔

میرا دوسرا سوال یہ تھا کہ جو ریاستیں ہر یونین سے الگ رہیں گی کیا اُن کے ساتھ تاج کا وہی تعلق رہے گا جواب تک ہے" سر اسٹیفرڈ نے کہا کہ" ہاں"۔

میں ۔ اُن کے حقوق کی حفاظت کون اور کس طرح کریگا۔

وہ ۔ ہم ایک وایسرائے مقرر کریں گے۔ اُس کے پاس فوج بھی ہوگی۔

میں ۔ کیا آپ کے خیال میں اس کا امکان ہے کہ آپ کا وایسرائے اور آپ کا گورنر جنرل ایک دوسرے کے خلاف فوج کشی کریں جبکہ کسی ریاست اور برطانوی صوبہ میں جھگڑا ہو۔

وہ ۔ ہاں انتہائی حالت میں اس کا بھی امکان ہے۔"

میں نے اس ملاقات کا ذکر تفصیل سے بیان کیا ہے تاکہ یہ معلوم ہوگا کہ سر اسٹیفرڈ ہر ایک سے اُس کے مزاج کے موافق بات چیت کرتے تھے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اُن کا بیان درست نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ یہ بالکل مہمل بات تھی کہ برٹش وایسرائے۔ برٹش گورنر جنرل کے خلاف فوج کشی کرے۔

اُسی روز پھر تین بجے شام حیدرآباد کے وفد سے ملاقات ہوئی جس میں میرے ساتھ نواب مہدی یار جنگ مرحوم اور سید عبدالعزیز بھی تھے۔ نواب علی یاور جنگ بحیثیت سکریٹری وفد شامل تھے۔

سر اسٹیفرڈ کے جوابات کا لب لباب یہ تھا کہ جو ریاستیں کہ کسی یونین میں شریک ہونگی اُن سے تاج برطانیہ کو کوئی تعلق نہ ہوگا۔ مگر جو تاج برطانیہ کی زیر حفاظت رہنا چاہیں گی اُن کو اس کی اجازت ہوگی اور

وایسرائے اُن کی حفاظت کریگا۔

میں نے کہا کہ اگر کوئی ریاست کسی یونین میں شریک بھی نہ ہو اور برٹش گورنمنٹ کی (PARAMOUNTCY) کو بھی پسند نہ کرے تو اس کا کیا حشر ہوگا۔ ان کا جواب یہ تھا "WE WILL NOT ASK A STATE TO DO A THING WHICH IT DOES NOT LIKE OR NOT TO DO THAT WHICH IT LIKES."

۳۱ مارچ ۴۲ء کو پرنسس چیمبر کی میٹنگ تھی جس میں سر وی۔ ٹی۔ کرشنا چاری نے سر سی۔ پی راماسوامی آئر کی تائید سے یہ ریزولیوشن پیش کیا کہ والیان ملک ایک یونین بنانے کی تجویز کو پسند کرتے ہیں۔ مگر اس کی کچھ زیادہ تائید نہیں ہوئی اور چانسلر کا پیش کردہ ریزولیوشن پاس ہوا۔ جس کا منشا یہ تھا کہ وہ ہندوستان کی خدمت کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ اُن کے اختیارات اقتدار کو بحیثیت حکمراں کوئی نقصان نہ پہونچے۔ اور انہیں بھی ریاستوں کی جانب سے یونین بنانیکا اختیار ہو۔

۲ اپریل کو سر اسٹیفرڈ سے پھر ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں انہوں نے صاف کر دیا کہ برٹش گورنمنٹ ہندوستان کی حکومت سے دست بردار ہونے کو تیار ہے۔ انہوں نے کہا کہ نئی یونین دوسرے ممالک سے براہ راست تعلق رکھ سکے گی۔ جو ریاستیں کسی یونین میں شامل ہوں گی اُن پر (PARAMOUNTCY) نہیں رہے گی یعنی برٹش حکومت سے انہیں کوئی تعلق نہ ہوگا۔ جو ریاست کسی یونین میں شریک نہ ہوگی اُسے خود مختار کر دیا جائے گا اگر خود چاہیں گی تو (PARAMOUNTCY) زیر رہے گی ورنہ خود مختار ہو جائیں گی میرے سوال کے جواب میں انہوں نے ان الفاظ میں ہندوستان کے سیاسی مستقبل کو بیان کیا۔

"WE WANT TO GET OUT OF INDIA, UNLESS IN

WANTS TO KEEP US IN INDIA."

انہوں نے والیان ملک سے یہ بھی کہا کہ سیاسی لیڈروں سے گفت و شنید کریں اس صورت نے والیان ریاست میں حیرت اور انتشار پیدا کر دیا۔ سر اسٹیفرڈ سے ملاقات کے بعد جب میں جے پور ہاؤس آیا تو وہاں میں نے والیان ملک کو بہت پریشان پایا۔ یہ انقلاب ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ممکن ہے کہ بعض اس سے مستثنیٰ رہے ہوں مگر والیان ملک کو اپنی رعایا سے کوئی براہِ راست تعلق نہیں رہا تھا۔ وہ اپنی رعایا پر بھروسہ نہیں کر سکتے تھے۔ جمہوریت کے سیلاب سے بچنا ناممکن تھا۔ عوام میں ایک ایسی حکومت کی خواہش پیدا ہو گئی تھی جس میں اُن کا بھی حصہ ہو۔ ایسے میں شخصی حکومت کا قیام ممکن نہ تھا۔ یہ ان کی پریشانی کے واسطے کافی تھا۔ مجھے مقبول محمود مرحوم نے ٹیلیفون کیا اور بتایا کہ والیان ملک نے ویسرائے سے جب یہ بیان کیا کہ سر اسٹیفرڈ نے یہ کہا کہ

"WE WANT TO GET OUT OF INDIA."

تو ویسرائے نے کہا کہ ہمیں لکھ کر دیجئے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ویسرائے اور سر اسٹیفرڈ کرپس ہم خیال نہ تھے۔

۱۶ اپریل ۱۹۴۲ء کو دہلی کی واپسی پر حضور نظام سے ملا۔ وہ سر اسٹیفرڈ کرپس کی گفتگو کے نوٹ سے بہت مایوس ہوئے۔ خاص کر اس وجہ سے کہ اس میں لکھا تھا کہ جو ریاستیں کسی یونین میں شریک نہ ہوں گی ان پر گورنمنٹ آف انڈیا کا تسلط یعنی (PARAMOUNTCY) قائم رہے گی۔

دوسرے روز SIR CLAND GIDNEY. سے ملا۔ دہلی کی گفتگو کے نوٹس انہیں دکھائے۔ وہ اس سے بہت خوش

تھے اور کہنے لگے کہ نوٹ ایک بڑا ہی PATHETIC DOCUMENT ہے گو زبان سے صاف نہیں کہا لیکن اس پر خوش تھے کہ مشن ناکامیاب رہا۔

شام کو نواب بہادر یار جنگ آئے اُن سے ایک عجیب بات معلوم ہوئی۔ اُن کا بیان ہے کہ "دس تاریخ کو جناح مسلم لیگ کا ریزولیوشن لے کر سر اسٹیفرڈ کرپس کے پاس گئے اور کہا کہ ہم لوگوں نے آپ کی تجویز مسترد کر دیا ہے لیکن سر اسٹیفرڈ نے کہا کہ آپ اسے واپس لے جایئے کل جب کانگریس مسترد کر دیگی تو آپ سے خود آکر لیجاؤں گا۔"

جناح نے یہ بھی کہا کہ وہ کانگریس سے بہت ناخوش تھے جب کانگریس کا ریزولیوشن مل گیا تو جناح کے مکان سے خود آکر مسلم لیگ کا ریزولیوشن لے گئے۔

میں حضور نظام کی خدمت میں دہلی کی رپورٹ پیش کر کے ریاست کے کاموں میں مصروف ہو گیا۔

حیدرآباد میں کئی انگریز ملازم تھے۔ وہ بعض اوقات اپنے انگریز ہونے کا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ حکومت ہند کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ہوائی جہاز سازی کا ایک کارخانہ کلکتہ سے ہٹا کر حیدرآباد میں لایا جائے جب یہ مسئلہ کونسل میں پیش ہوا تو کونسل نے اختلاف کیا جس کی وجہ یہ تھی کہ جہاں ایسے کارخانے ہیں وہاں ہوائی جہاز بمباری بھی کرتے ہیں۔ کرنل سلاٹر نے جو اس تجویز کے حامی تھے ایک خط لکھ کر بھیجا کہ اس پر نظر ثانی کیا جائے ورنہ حکومت ہند کا اعتبار ہم پر کم ہو جائے گا۔ کرنل سلاٹر سرکاری ملازم تھے اور مجھے اس فقرہ پر سخت ناگواری ہوئی میں نے کہا (LET IT BE SHAKEN) لیکن کسی شخص کو ہمیں یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ حکومت ہند کی نظر میں کیا چیز ہمارے اعتبار کو قائم رکھے گی

ہیں۔ اندازاً پہاڑ کی چوٹی تک چھ سات سو سیڑھیاں ہونگی۔ نظام شہزادے ... کے کاندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے اور ہر چھ فٹ پر آستانہ بوسی کرتے ہوئے ... گئے۔ باوجود پیرانہ سالی اور نقاہت جسمانی کے اُن کا اس طرح چڑھنا حیرت انگیز تھا۔ البتہ شہزادگان پر یہ ورزش جسمانی شاق تھی اُن کا طرز تنفس اور حالت تنفس اس پر شاہد تھی۔

ہم ایک عمارت پر پہنچے۔ اس کے آخر میں ایک کمرہ ہے اس کے در و دیوار پر شیشہ کا کام ہے کمرہ کے اندر ایک جگہ بہت سے پھولوں کے ہار وغیرہ رکھے تھے۔ سرکار اور جملہ شہزادگان نے پھولوں کے سامنے ... کئے۔ میری جبین عبودیت تو ایک ہی آستانہ کی سجدہ گزار ہے میں معذور رہا۔ کچھ فضائل حضرت علی کرم اللہ وجہہ بیان کئے گئے اور بعد اس درگاہ سے نظام کو ایک جلد کلام پاک اور ایک "تلوار" دی گئی جس ملازم کے دونوں ہاتھوں میں قرآن شریف تھا۔ وہ حضور نظام کے آگے چلتا تھا اور نظام اس کے پیچھے۔ مجھے یہ طرز آداب کلام پاک بہت پسند آیا۔ واپسی کے وقت ہلکی ہلکی بارش شروع ہوگئی حیدرآباد میں جس جلسہ میں ہوں کوئی شخص چھتری نہیں لگا سکتا تھا۔ یہ دیرینہ ... تھا مقصد یہ تھا کہ صاحب چتر و علم تو فقط حکمراں ہو سکتا ہے۔ ... اس شخص کے کہ جس کے ہاتھ میں کلام پاک تھا یا نظام کے دیگر ... چھتریوں کے روانہ ہوگئے۔ یہ غنیمت ہوا کہ بارش تیز نہ تھی۔ راستہ میں تھوڑی سی ہموار جگہ ہے۔ جہاں شامیانہ لگا کر کمال یار جنگ ... جو ہمراہی ہوں انہیں چائے یا کافی پیش کرتے تھے۔ چنانچہ ہم ... چائے نوشی ہوئے۔ جس شخص کے ہاتھ میں قرآن شریف تھا وہ سرکار کے ... کی کرسی پر بیٹھتا تھا۔

غلام محمد صاحب مرحوم کی یہ بڑی خواہش تھی کہ نظام آن ...

گئیں مجھ سے کہا تو میں نے کہا کہ دشوار ہوگا۔ حیدرآباد کی روایات یہ ہیں کہ صدر اعظم کی وساطت سے ہر بات نظام کے سامنے پیش ہو۔ میرا خیال ہے کہ یہ طریقہ کابینہ میں اتفاق قائم رکھنے کے واسطے اچھا تھا ورنہ پارٹی بندی ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ مگر غلام محمد مرحوم نہ مانے اور ہوش بلگرامی کے ذریعہ اسے گوش گذار کیا۔ ہوش سرکار کے اسٹاف کے لوگوں میں سے تھے۔ ۲۲ جولائی کو میرے پاس کاظم یار جنگ یہ پیام لائے کہ میں غلام محمد صاحب سے کہدوں کہ انہیں جو کچھ عرض کرنا ہو صدر اعظم کے ذریعہ سے اور اگر صدر اعظم نہ ہوں اور ضروری بات ہو تو چیف سکریٹری یا کاظم یار جنگ کو لکھیں۔ مجھے افسوس ہوا کہ غلام محمد صاحب مرحوم نے اسے نامناسب سمجھا ورنہ میں نے منع کیا تھا۔ یہ طریقہ حیدرآباد کے واسطے ضروری تھا۔ ورنہ سازشوں کی گرم بازاری حیدرآباد کے انتظام مملکت کو ختم کر دیتی۔ حضور نظام اس وجہ سے بھی اس تجویز کو پسند نہیں کرتے تھے کہ سوائے صدر اعظم کے دوسرے وزراء کو بھی باریابی کا براہ راست موقع دیا جائے تو پھر انگریزی وزیر کو بھی یہی اختیار ہوگا کہ براہ راست حکمراں سے معاملات طے کرے۔ اسے نظام نہ پسند کرتے تھے اور نہ مناسب تھا۔

۲۴ اگست ۴۲ء کو سرکار نے فرمایا کہ بہادر یار جنگ اور ابوالحسن سید علی ... ملنے حاضر ہوئے تھے اور اپنے غیر مطمئن ہونے کا اظہار کر رہے تھے سبب یہ تھا کہ حیدرآباد کے حقوق کے متعلق جو نوٹ تیار کیا جا رہا ہے اس میں ان حضرات کا بھی مشورہ ہو۔ حضور نظام نے یہ بھی فرمایا کہ سوائے وزیروں کے اور ممبروں کی رائے سے ہمیں مطلع کیا جائے۔ اس مسئلہ کو جب ۲۴ اگست ۴۲ء کی کونسل میں پیش کیا تو متفقہ رائے یہ تھی کہ کونسل اس ... تیار نہیں ہے کہ ایسے اہم مسائل میں باہر کے حضرات کو شریک اور ... سکے۔ اگر نظام پسند فرمائیں تو ہم عہدوں سے کنارہ کش ہو جائیں۔

حضور نظام کو جب گورنمنٹ کی طرف سے کوئی مراسلہ جاتا تھا تو چنانچہ یہی عرضداشت بھیجی گئی۔
عرضداشت کی صورت میں پیش ہوتا تھا۔
شروع اس طرح ہوتی تھی۔
"بہ پیشگاہ اعلیٰ حضرت بندگان وعالی ومتعالی مدظلہ العالی"
"بعد آستانہ بوسی مودبانہ عرض ہے"
اور ختم اس طرح کیجاتی تھی۔
"الٰہی آفتاب عمر و دولت و اقبال تاباں و درخشاں باد"

عرضی
فدوی جاں نثار
(دستخط صدر اعظم)

۵ اگست کے روزنامچہ میں نے لکھا ہے کہ بہادر یار جنگ ملنے آئے دوران گفتگو میں مجھے یہ معلوم ہو کر حیرت ہوئی کہ یکم اگست کو یاد میلاد النبی سرکار کے طلبیدہ حاضر ضرور ہوئے تھے مگر گفتگو صرف برار کے طرز حکومت کے متعلق تھی۔ اور انہوں نے میری گورنمنٹ کے کام پر کسی غیر مطمئن جو کا اظہار نہیں کیا۔ اور کہنے لگے "یوں سرکار مالک ہیں جو فرماتے ہیں کو اور درست کہنے کے سوا کیا چارہ ہے"

سنہ ۱۹۴۲ء تو سارے ہندوستان میں سیاسی طوفان خیز مظاہرں کا سال تھا۔ اس کا اثر ریاستوں پر بھی پڑا۔ چنانچہ حیدرآباد میں بھی طلبا نے مظاہرے اور شورش شروع کر دی۔ ناظم (ڈائرکٹر) تعلیمات اور وزیر تعلیمات کو بلا کر مشورہ کیا اور طے پایا جیسا کہ ایک بار علی گڑھ یونیورسٹی میں کیا گیا تھا طلباء کے والدین اور سرپرستوں کو بلایا جائے اور وہ اپنے بچوں کو نرم طریقوں سے فہمائش کریں۔ یہ تدبیر ایک بہت بڑی حد تک کامیاب

ہوئی اور شورش کے مظاہرے بند ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ نوعمر طلباء سے معاملہ کرنے میں بجائے استبدادی کارروائی کرنے کے یہ طرز زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ ارکان حکومت کے مقابلہ میں غصہ اور ضد بڑھتی ہے لیکن اپنے بزرگوں کے سامنے نوعمر ٹھنڈے دل سے بات سننے کو تیار ہو جاتا ہے اور مان لیتا ہے۔ پھر جتنی شورش کرنے والوں کی تعداد ہوتی ہے اتنی ہی سمجھانے والوں کی ہوتی ہے۔ تو عمر کو غرور نفس جسے وہ خودداری سے تعبیر کرتا ہے اپنی ضد پر جماتا ہے۔ پھر عمال حکومت کا تیز اور ترش طرز عمل نوعمر کو بہت شاق گزرتا ہے۔ اور وہ مناسب بات کو بھی تسلیم کرنے کو اپنی شکست سمجھتا ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ اساتذہ کی طلبا کے دلوں میں عزت نہیں دوسری طرف اساتذہ میں شفقت نہیں۔ پرانا نظریہ۔

"جور استاد بہ زمہر پدر"

بالکل مفقود ہو گیا ہے۔ گھر کے بزرگ بڑی حد تک طلبا کو شورش سے روکنے میں مدد دے سکتے ہیں۔

۲۹ اگست ۱۹۴۲ء کو حضور نظام سے بہت خانگی معاملات پر گفتگو رہی۔ میری ذاتی آمدنی، بچوں کی تعداد، شادی شدہ کتنے اور غیر شادی شدہ کتنے ہیں، محراب میں قرآن اب بھی سناتا ہوں یا نہیں۔ دریافت فرماتے رہے۔ سیاسی حالات پر گفتگو رہی۔ میں نے عرض کیا کہ خدا کا کرم ہے کہ جیسی شورش انڈیا میں ہے۔ حیدرآباد اس سے محفوظ ہے۔ اگر یہاں ہوتی تو برٹش انڈیا کی حالت نازک نہ ہوتی۔ فرمایا "کیوں" میں نے عرض کیا کہ یہاں رعایا کے وفادار ہیں۔ وہاں نہیں ہیں کہنے لگے "یہ تو بڑا فرق ہے" میں نے اس موقع پر کہا کہ ہندو جماعت کو بھی ساتھ رکھنا ضروری ہے۔ سرکار نے جو فرمایا اس کا مطلب تھا کہ شورش کرنے والوں کو سزا دینی چاہئے۔ میں نے کہا کہ شوریدہ سر کا علاج سختی ہے۔ مگر عام لوگوں کے دلوں کو بھی ہاتھ میں لینا ضروری ہے۔

[ا]ظہار فرمائیں۔ میں نے کابینہ کی اس رائے کو پسند کیا۔ اس لئے کہ اعلیٰ حضرت ایسے خطاب کے ملنے کے متعلق کئی بار فرما چکے تھے۔ اور انہیں کے حکم کی تعمیل میں اس خطاب کی تحریک میں نے کی تھی۔

۹ جنوری ۱۹۴۳ء کو میں دفتر پیشی میں حاضر ہوا۔ اور کونسل کی اس قرارداد کو سرکار میں پیش کیا۔ مجھے سخت حیرت ہوئی کہ اعلیٰ حضرت ایسا فرمان لکھنے سے گریز فرماتے ہیں اور مجھ سے فرمایا کہ تم ریزیڈنٹ سے مل لو اور کہو کہ اس بیان کی طرف سرکار نے کونسل کی توجہ دلائی مگر کونسل کی یہ رائے ہے کہ اس وقت اعلیٰ حضرت کا اس بیان کی تردید کرنے سے غلط فہمی پیدا ہوگی۔ میں نے عرض کیا کہ کونسل کا فیصلہ میں پیش کر چکا ہوں کونسل ایسی تردید کی موافقت میں ہے اور کونسل کی قرارداد کوئی راز نہیں جو ریزیڈنٹ کے علم میں نہ ہو۔ فرمایا اچھا تم ریزیڈنٹ سے کہنا کہ سرکار کی یہ رائے ہے میں نے عرض کیا کہ تعمیل ہوگی۔

دوسرے روز میں ریزیڈنٹ سے ملا۔ وہ بہادر یار جنگ کی تقریر کا ترجمہ لئے ہوئے نہایت برہم بیٹھے تھے میں نے انہیں کونسل کا ریزولیوشن دکھایا [وہ اس]ے ناکافی خیال کرتے تھے میں نے اس تمام گفتگو کا نوٹ تیار کرایا جس کا منشاء یہ تھا کہ نہ صرف کونسل کی رائے کے مطابق سرکار فرمان جاری کریں بلکہ سرکار کو حکم دینا چاہئے کہ بہادر یار جنگ معافی مانگیں۔ میں نے دوسرے روز اپنی ملاقات کا نوٹ پیش کیا۔ سرکار نے حکم دیا کہ کونسل کی رائے کے مطابق جریدے میں فرمان شائع ہو۔ میں نے سرکار سے عرض کر دیا کہ وہ بہادر یار جنگ کو حکم دیں کہ اب کوئی مضمون نہ لکھیں۔ چنانچہ ناظم پولیٹیکل کے ذریعہ ایسا حکم چلایا گیا۔

پرنس کا خطاب G.B.E. میرے واسطے ایک درد سر بن گیا جس کا قصہ عرصہ تک چلتا رہا ریزیڈنٹ نے اس معاملہ کو دہلی بھیجا تاکہ وہاں کی ہدایات

[حاص]ل کرے۔

۱۱ جنوری کو میں بھوپال پہنچا اور ۱۲ کو وہاں سے چل کر لکھنؤ آیا۔ سر موریس ہیلٹ گورنر تھے اُن سے ملا۔ اس زمانہ میں جنگ کی وجہ سے برٹش گورنمنٹ نے منسٹروں کی بجائے ایڈوائزرس مقرر کر رکھے تھے۔ انہوں نے مجھ سے مشورہ کیا کہ اگر منسٹر مقرر کئے جائیں تو کیسا ہو میں نے کہا کہ اگر آپ منسٹر مقرر کر دیں تو اسمبلی کو جواب دہ ہوں تب تو ٹھیک ہوگا۔ لیکن جب تک اسمبلی بر سر کار نہ ہو اس وقت تک منسٹروں کا ہونا بے معنی ہوگا۔

انہوں نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ خلیق الزماں صاحب حیدرآباد میں ملازمت چاہتے ہیں گورنر کے سکرٹری نے کہا کہ چودھری خلیق الزماں نے یہ خواہش کی ہے کہ گورنر حیدرآباد کے ریزیڈنٹ کو اُن کی ملازمت کے متعلق لکھیں۔ گورنر نے یہ کہا کہ وہ مجھ سے ذکر کر دیں گے۔ خلیق الزماں بھی ملے اور کہا گورنر نے مجھ سے ذکر [کیا ہو]گا۔ مگر وہ یہ چاہتے تھے کہ ملازمت میں حیدرآباد [جا]نا نہ ہو، لکھنؤ میں ہی کچھ ہو جائے جو ممکن نہ تھا۔

۲۱ جنوری ۱۹۴۳ء کو سر ہنری کریگ سیاسی مشیر حکومت ہند سے ملا۔ وہ بہادر یار جنگ کے مضمون پر بہت برہم تھے۔ گفتگو کے بعد یہ طے پایا کہ اعلیٰ حضرت خود بہادر یار جنگ کو بلا کر فہمائش فرمائیں اور سزا کے طور پر [چھ] ماہ کے واسطے وہ نظام پاس حاضر نہ ہو سکیں (جسے حیدرآباد کی زبان میں ڈیوڑھی بند ہونا کہتے ہیں) اور کسی جلسہ میں چھ ماہ تک کوئی تقریر نہ کریں۔ [نواب] بہادر یار جنگ نے خود کہا کہ میرا آقا مجھ سے ناخوش نہیں ہے۔ یہ صورت حیدرآباد کے واسطے بہت دشواریاں پیدا کرتی تھی اور حکومت کی دشواریوں میں اضافہ ہو جاتا تھا۔

سر آرتھر لوتھین ریزیڈنٹ چاہتے تھے کہ شیر کے شکار کا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ ورنگل کے جنگلات میں شکار کا انتظام ہوا۔ ہماری پارٹی میں

سر آرتھر لودین۔ لیڈی لودین اور مس لودین یہ چاہتی تھیں کہ انہیں بھی شیر
ملے۔ میں نے محکمہ شکار کو تاکید کردی تھی کہ شکار کا ایسا ہی ایک مچان پر
تو میں اور لیڈی لودین بیٹھے۔ دوسرے پر ریذیڈنٹ اور تیسرے مچان پر
بیٹی مس لودین تھیں۔ میرا اور لیڈی لودین کا ارادہ تو خود شکار کھیلنے کا نہ
تھا۔ اس لئے گو شیر ہمارے قریب سے نکلا مگر میں نے بندوق نہیں چلائی۔ ریذیڈنٹ
نے اُسے مار لیا۔

میں نے اس کا انتظام کیا تھا کہ مس لودین کے مچان کے برابر بہت
اچھے شکاری بیٹھیں تاکہ اگر اُن سے بچ بھی جائے تب بھی شیر جانے نہ پائے۔
دو شیر نکلے ایک تو ریذیڈنٹ نے مارا اور دوسرا مس لودین نے۔ بندوق
شکاری کی بھی چلی۔ بہرحال شیر مس لودین کا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان
دونوں شیروں کو ایک مہینہ سے دو کٹڑے ہر تیسرے روز دیئے جاتے تھے
اور جب وہ حسب عادت تھوڑا کھا کر چھوڑ جاتا تھا تو اس میں تھوڑی افیون
ملا دی جاتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ شیر اس جنگل سے باہر نہیں جاتے تھے
شکار کے روز بھی کٹڑے پر بے تکلف مچان کے سامنے آ گئے۔

۷ مارچ ۳۴ء کو ہز ہائینس جام صاحب نوانگر حیدرآباد آئے۔ جم
یہاں ڈنر تھا۔ تقریر میں میرے لئے بڑے اچھے کلمات فرمائے۔ نجی
طور پر جو گفتگو ہوئی اس سے معلوم ہوا کہ والیان ملک اپنے وزرا سے
مطمئن نہ تھے۔

میں نے ۸ مارچ کو ایک مسودہ بہادر یار جنگ کو معافی نامے کا
بنا کر بھیجا۔ انہیں فقط ایک فقرے پر اختلاف تھا۔ میں نے صغیر صاحب
کو بھیج کر کہلوایا کہ وہ مسودہ پر دستخط کر دیں۔ جسے انہوں نے مان لیا۔ مگر
صغیر صاحب سے کہا کہ اعلیٰ حضرت نے اُن سے یہ کہلا دیا ہے کہ جو
نکلے گا اُنہیں دکھا لیا جائے گا۔ اس طرح کی دشواریاں حیدرآباد میں

ہیں۔ جو انتظامی در و بست میں مخل اور حکومت کے وقار کو نقصان دہ ثابت
ہوتی ہیں۔ بہرحال بہادر یار جنگ نے جو بیان لکھ کر بھیجا اس سے ریذیڈنٹ
اور گرگسن بھی مطمئن نہ تھے وہ چاہتے تھے کہ سختی کی جائے۔

سرکار نے جام صاحب کو جو پیغام دیا تھا اُس موقعہ پر گرگسن سے کچھ
ایسی گفتگو کی کہ وہ یہ سمجھا کہ سرکار بہادر یار جنگ پر سختی کے موافق ہیں۔ گرگسن
نے مجھ سے کہا کہ اعلیٰ حضرت سختی کے موافق ہیں سختی کرنی چاہئے۔ میں خاموش
ہو گیا۔ لیکن جب غلام محمد سے گرگسن نے کہا کہ تو غلام محمد نے کہا کہ تم ناسمجھ
ہو ریاست کی چالوں کو پہچانتے نہیں ہو۔ میں عجیب کشمکش میں تھا۔
سرکار قلباً زیادہ سختی کے خلاف تھے۔ لیکن گرگسن سے یہ خیال ظاہر نہیں کیا
میں اصلی حالت کہنا وفاداری کے خلاف سمجھتا تھا۔

۱۲ مارچ کو میں، گرگسن، علی یاور جنگ، اور پینڈرسن (انسپکٹر جنرل پولیس)
سب ریذیڈنٹ سے ملے۔ وہ چاہتا تھا کہ جتنی سختی ممکن ہو بہادر یار جنگ
پر کی جائے۔ میں نے کہا کہ آپ کیا چاہتے ہیں ریذیڈنٹ نے کہا کہ
(۱) بہادر یار جنگ کی ڈیوڑھی چھ ماہ کے واسطے بند کر دی جائے یعنی وہ
نظام کے پاس حاضر نہ ہو سکیں۔
(۲) وہ چھ ماہ تک کوئی تقریر نہ کریں اور نہ کوئی مضمون لکھیں۔
(۳) انہیں اُن کی جاگیر میں محبوس کر دیا جائے۔

میں نے کہا کہ جاگیر میں محبوس کرنے پر شورش کا اندیشہ ہے۔ وہ بولے
میں تو اپنی ہدایات کے مطابق کہوں گا۔ اب آپ کو اختیار ہے۔
شام کو سرکار نے طلب فرمایا۔ میں نے ریذیڈنٹ کی گفتگو کا ذکر کیا۔
[illegible] تیار ہیں کہ چھ ماہ کے واسطے بہادر یار جنگ کو حکم دیں کہ وہ کوئی
[illegible] لیکن یہ چاہتے ہیں کہ گو وہ خود بہادر یار جنگ کو نہیں بلائیں گے مگر
[illegible] سفارش نہ کرے۔

۱۴ مارچ ۱۹۴۳ء آج مسٹر ولیم فلپ (جو کہ پریسیڈنٹ روزویلٹ کے ذاتی نمائندے کی حیثیت سے ہندوستان آئے ہیں) حیدرآباد تشریف لائے اور میرے پاس شاہ منزل میں ٹھہرے۔ اسٹیشن پر میں اور ریزیڈنٹ دونوں موجود تھے۔ میں نے ان کی ملاقات نظام سے طے کر لی۔ سرکار دریافت کرنے لگے کہ وہ مسٹر فلپ سے کیا گفتگو کریں۔ میں نے عرض کیا احتیاط برتیں اور برٹش گورنمنٹ کی برائی نہ کریں۔ میرے یہاں ایک بڑا ڈنر تھا جس میں ریزیڈنٹ اور بہت لوگ تھے۔ ریزیڈنٹ ڈنر کے بعد مسٹر فلپ کو لیکر الگ باتیں کرتے رہے۔

۱۵ مارچ ۱۹۴۳ء کو مسٹر فلپس کا لنچ ولیعہد کے یہاں تھا۔ میں بھی شریک تھا۔ شب کو میں نے ایک بہت بڑا ڈنر مسٹر فلپس کو دیا۔ مجھ سے دوران گفتگو میں مسٹر فلپ کہنے لگے کہ اس کی کیا وجہ کہ انڈسٹریز یہاں ترقی نہیں کر رہی ہیں۔ میں نے کہا کہ حیدرآباد ہی نہیں یہ تو سارے ملک کا حال ہے وہ کہنے لگے کہ میرا بھی یہی مطلب ہے اور وجہ ظاہر ہے۔ انگریز یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان (RAW MATERIAL) تیار کیا کرے اور انگریز مصنوعات (FINISHED GOODS.) بھیجا کریں۔ پھر کہا کہ اسی کو (EXPLOITATION) کہتے ہیں۔

ان کی یہ رائے ہے کہ صوبوں کو اختیارات کامل ہوں اگر چہ خود مرکزی حکومت کو طاقتور بنائیں تاکہ ہندوستان کی وحدانیت قائم رہے اور یکجائی قوت خراب نہ ہو۔ یعنی فیڈریشن ہو۔

شام کو انہیں گولکنڈہ کا قلعہ دکھانے لے گئے اور گنبدوں میں جہاں شاہان سلف کے مزار ہیں چائے کا انتظام کیا تھا۔ میں نے غلام محمد مرحوم کو بھی چائے پر بلا کر ان سے ملایا۔ دوران گفتگو ان کے بیان سے ثابت ہوتا تھا کہ ہندوستان کے مستقبل میں امریکن حکومت کو تجارت اور اقتصادیات میں بہت دخل ہوگا۔ تجارت سب اقوام کے لیے

یکساں کھلی ہوگی اور اس طرح (RAW MATERIAL) یعنی کچا مال کی خرید اور برآمد کا سب کو اختیار ہوگا۔ وہ مجھ سے یہ دریافت کرتے تھے کہ آیا مسلمان ہمیشہ علیحدہ رہیں گے۔ میں نے کہا کہ میرے خیال میں علیحدگی کا اختیار ملنے کے بعد دونوں مجبور ہوں گے کہ ملکر رہیں۔ میری یہ رائے غلط ثابت ہوئی۔ مجھے ۱۹۴۳ء میں اس کا بھی یقین نہ تھا کہ ہندوستان کی تقسیم ہوگی۔ ہندوستان کے کروڑوں مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ نہ برٹش اس پر راضی ہونگے اور نہ ہندو اسے تسلیم کریں گے۔ یہ مطالبہ تو فقط حقوق لینے کے واسطے تھا۔ بقول صابری کے۔

سمجھتے تھے رہے گی جنگ محدود گل و بلبل
مگر تقسیم نظم گلستاں تک بات جا پہونچی

حیدرآباد کے قیام کے زمانہ میں مجھ سے مسٹر فلپ نے یہ بھی کہا تھا کہ پریسیڈنٹ روزویلٹ نے مسٹر چرچل کو لکھا کہ ہندوستان کو آزادی دے دی جانا چاہئے۔

۱۶ مارچ ۱۹۴۳ء زمانہ جس طرح بدل رہا تھا اس کے آثار و نشانیاں ظاہر ہو رہی تھیں۔ ریزیڈنٹ حالانکہ لنچ پر اور ڈنر پر ان سے مل چکے تھے مگر ان کی خواہش پر میں نے انہیں پھر لنچ پر بلا لیا۔ چلتے وقت انہوں نے فلپس سے یہ خواہش کی کہ وہ شام کی چاء ریزیڈنٹ کے یہاں نوش فرمائیں مگر فلپس نے معذرت کر لی کہ اسے فرصت نہیں ہے۔ یہ صاف علامت تھی جو انقلاب کی نشاندہی کر رہی تھی۔ کبھی برٹش امپائر میں سورج غروب نہ ہوتا تھا۔ اب وہ خود آفتاب لب بام ہو گئی تھی۔

شام کو میں مسٹر فلپس کو راجہ دھرم کرن اور کمال یار جنگ کے گھر لے گیا۔ وہ امراء کے ان پرانے مکانوں کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے کچھ ساڑیاں وغیرہ خریدی تھیں۔ میں نے ان سے کہا کہ انہیں میری طرف

اس بارہ میں ہو (جو کہ طبع ہوگا) وہ میری پوزیشن اور (DIGNITY)
کے مطابق ہو نہ کہ ایسا جس پر ممکن ہے کہ چو طرف
سے نکتہ چینی شروع ہو جائے (اندرون و بیرون ملک) لہٰذا
اس کو بچانا ضروری ہے۔ لیں میں نے سب امور کی پیش نظر
رکھتے ہوئے ایک جامع مسودہ تیار کیا ہے وہ سب امور پر
حاوی ہے (جس کا تذکرہ عرضداشت میں ہے) لیں اگر کونسل کو یہ
منظور ہے کہ میں اپنے (PREROGATIVE) کو استعمال
کرتے ہوئے فرمان جاری کروں تو میں بخوشی اس مسودہ کے مطابق فرمان
جاری کرنیکو تیار ہوں.......

نقل فرمان

ممالک محروسہ سرکار عالی میں جتنی سیاسی انجمنیں ہیں۔ اس سے
بحث نہیں کہ کسی قوم اور ملت کی ہیں۔ اُن کو حکم دیا جاتا ہے کہ
دوران جنگ میں کسی قسم کی شر انگیز تقاریر نہ کریں۔ نہ مضامین
لوکل اخبارات میں شائع ہوں تاکہ کسی قسم کا نقص امن یا ملک
میں بے چینی پیدا نہ ہو۔ ورنہ اس کے خلاف عمل ہو تو گورنمنٹ
خاطیوں کے ساتھ سخت تدارک کرنے پر آمادہ ہو جائیگی۔

ہاں۔ وہ بات اور ہے اگر کسی فریق کو اپنی جائز شکایات
یا مطالبات کے متعلق لب کشائی کی نوبت آئے تو اس کو درست
طریقہ پر اور آئینی طریقہ پر کر سکتا ہے، جبکہ یہ ہمہ قسم کی گرفت
سے خالی ہو۔ اور اس صورت میں اس پر گورنمنٹ غور کر سکتی
ہے۔ نظر بر آں دُنیا کے اس مقولہ پر نظر رہے کہ صلح و آشتی سے
بیگانے اپنے ہو جاتے ہیں۔ اور جنگ و جدال سے دوست،
دشمن بنجاتے ہیں۔

...بلو تحفہ قبول فرمائیں۔ بہت اصرار کے بعد مانے۔
...مارچ ۱۹۴۸ء کو کچھ فوجی کرتب دیکھنے پریڈ کے میدان میں گیا۔ ریزیڈنٹ
...ے تھے۔ ایک شخص دو گھوڑوں پر بیک وقت سواری کر رہا تھا۔
ریزیڈنٹ کہنے لگے۔

"RESIDENT, THE PRESIDENT SHOULD ALSO LEARN TO RIDE ON TWO HORSES."

میں نے ہنسکر کہا۔

"HE DOES NOT RIDE ON TWO HORSES BUT ... TWO MASTERS.

RESIDENT "NO HE BRIDGES THE GULF BETWEEN THE TWO IF ANY"

اس خلیج پر پل بنانا صدر اعظم حیدر آباد کا سب سے مشکل اور نازک کام
...تھا۔

۲۲ مارچ ۱۹۴۸ء کی شام کو سرکار کا ایک فرمان منسٹر پیشی کے خط
کے ساتھ آیا۔ یہ بہادر یار جنگ کے متعلق تھا۔ میں اسے انہیں الفاظ میں
نقل کرتا ہوں تاکہ اُس زمانہ کی طرز تحریر اور عبارت کا اندازہ ہو سکے۔
...حضرت کے الفاظ تھے۔ منسٹر کو دخل نہ تھا۔
"بخدمت شریف عالیجناب نواب سر محمد احمد سعید خان صدر اعظم باب حکومت
"ایک فرمان مبارک کی نقل بھیجکر آپ کو تحریر کرنے کو سرکار کا جو حکم
...ہے۔ وہ حسب ذیل ہے:"

کونسل کی عرضداشت مورخہ ۱ ربیع الاول ۱۳۶۵ھ کو میں
نے غور سے دیکھا اور آج بالمشافہ نواب صاحب چھتاری سے
بھی گفتگو تفصیل سے کی۔ چونکہ میری پوزیشن بحیثیت حکمراں ہونے
کے۔ اپنی حد تک بڑی ذمہ داری رکھتی ہے۔ لہٰذا جو کچھ میرا فرمان

بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ بہادر یار جنگ جب تقریر کرنے اسٹیج پر کھڑے ہوتے ہیں تو ان کی زبان قابو میں نہیں رہتی یعنی حدود معینہ سے باہر ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جو موجودہ سیاسی فضا کو مکدر بناتی ہیں۔ لہذا اُن کو بھی چاہئے کہ حزم و احتیاط سے کام کریں۔ ورنہ کسی وقت ہلچل پیدا ہو جائے تو اس کی ذمہ داری مقرر پر ہوگی۔ اور میرا بحیثیت حکمراں ہونے کے یہ فرض ہوگا کہ جو کوئی اس حکم کی خلاف ورزی کرے اس کا سدِ باب کروں۔ نظر بر آں میری دانست میں یہی مناسب ہے کہ ایک سال تک بہادر یار جنگ کسی قسم کی تقریر نہ کریں یا کسی قسم کا بیان اخبار میں شائع نہ کریں تاکہ اپنے ہاتھوں نہ خود کو مشکلات میں ڈالیں اور نہ دوسری طرف گورنمنٹ کو ان امور کی وجہ درد سری اٹھانی پڑے جیسا کہ شیخ سعدی نے کہا ہے۔

مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

میرا یہ حکم پبلک کی اطلاع کی غرض سے جریدۂ غیر معمولی میں شائع کیا جائے۔

اسی زمانہ میں غلام محمد صاحب مرحوم کا بجٹ میری عرضداشت کے ساتھ پیش ہوا جس میں انہوں نے انکم ٹیکس لگانے کی خواہش کی تھی جس کا پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ اور نظام نے منظور نہیں کیا۔ اسی سلسلہ میں ایک اور فرمان صادر ہوا۔

جس کی نقل حسب ذیل ہے۔ بعینہٖ راز

بسلسلہ فرمان دیروز متعلق انکم ٹیکس اس قدر اور کہہ دینا ضروری خیال کرتا ہوں کہ حال میں سالار جنگ نے دوران انٹرویو مجھ سے کہا کہ طبقۂ امرا ہمستان وغیرہ غور کر رہے ہیں کہ اگر نظام نہ ہوں تو ریاست

کے خاص حالات پر نظر کئے (جس کی تفصیل برٹش انڈیا ہو یا کوئی اور انڈین اسٹیٹ ہو نہیں سکتی) اور وہ بھی ایسے حالات میں اور دوسری طرف دوران جنگ ہے۔ ایسے موقع پر اگر جبراً قہراً یہ نافذ کیا جائے گا تو سخت ایجی ٹیشن اس کے خلاف میں پیدا ہوگا۔ اور متفقہ طور پر یہ مختلف گروہ رئیس کے یہاں درخواست دینگے کہ رئیس اپنے (PREROGATIVE) کو کر کے ایسے امور کا سدِ باب کرے کہ رئیس اپنی حد تک بڑی ذمہ داری رکھتا ہے اپنے ملک میں امن و امان قائم رکھنے کی۔

اس پر میں نے اُن کو جواب دیا کہ کوئی کام میری گورنمنٹ ایسا نہ کریگی جو موجب ہوگا۔ لہذا اس طرف میں کونسل کو متوجہ کرنے والا ہوں۔

اس کے بعد کہا کہ فنانس ممبر کو اپنے (PROFESSION) کو اچھا سمجھتے ہوں تاہم وہ یہاں کے حالات اور روایات سے واقف نہیں ہیں جب سے وہ یہاں آئے ہیں ان کی ایسی تجاویز کی وجہ سے وہ تمام طبقوں میں ہر دلعزیز نہیں رہے بلکہ ان کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جا رہا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ معلوم نہیں ان کی دوران ملازمت میں کیا فتنے کھڑے ہوں اور اگر ایسا ہوا تو ممکن ہے کہ ان کی حد تک مخالفت یہاں بڑھ جائے۔ اس پر میں نے کہا کہ ایسے امور میرے کان تک بھی میرے ذرائع سے پہنچے ہیں۔ آخر میں کہا کہ بجز چند مستثنیات انقلاب عالم کی وجہ سے تمام بھی رعایا کی سلطنت کی وفاداری مشتبہ ہوگئی ہے۔ ایسی حالت میں تدبر کا اقتضا یہ ہے کہ ان کو ایسے اندھا دھند امر سے اور نہ خراب کیا جائے بلکہ علی حالہٖ رکھنے کی ضرورت ہے کہ یہی طبقے ریاست کی (BACK BONE) ہیں۔ اس پر میں نے کہا کہ اُن کا کہنا ضرور قابل غور ہے۔"

اس فرمان سے قدرتاً غلام محمد صاحب مرحوم کو پریشانی ہوئی۔ میں نے

انہیں سمجھایا کہ آپ ایسی تجاویز پر کیوں اصرار کرتے ہیں کہ جن سے نہ رئیس ہی خوش ہو اور نہ عوام پسند کریں۔

انہیں دنوں مسز میر خاں جو امریکن لیڈی تھیں میرے پاس آئیں اور میر خاں کی جو کیبنٹ سکریٹری تھے شکایت کی۔ اس خانگی معاملہ میں صدر اعظم کیا کر سکتا تھا۔ لیکن میں نے انہیں بھی سمجھایا۔ اور میر خاں کو بھی سمجھایا۔ اس وقت تو معاملہ روبہ اصلاح ہو گیا تھا مگر سننے میں آیا کہ تین چار سال بعد علیحدگی ہو گئی۔ بین الاقوامی شادیوں کے نتائج اکثر ناخوشگوار ہوتے ہیں۔ حسن ظاہر کی عارضی فریفتگی بہت جلد ختم ہو جاتی ہے جو عمر بھر نباہتی ہے اور ہر اختلاف کو دبا دیتی ہے وہ خاندانی روایات ملکی اور قومی روایات اور یکساں خیالات اور نقطۂ نظر ہے۔ جب نقطۂ نظر مختلف ہوں خیالات میں تصادم ہو۔ تو پھر زندگی بدمزہ ہو جاتی ہے اور عمر بھر نباہنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

اسی زمانہ میں حضور نظام کچھ علیل ہو گئے۔ اور میں بجائے دفتر بیٹھی کے ندی باغ میں حاضر ہوا۔ مجھے یہ بھی اجازت دیدی گئی تھی کہ بغیر دستار بکلوس حاضر ہوں۔ حیدرآباد کے آداب کا یہ حصہ تھا کہ نظام کے سامنے جو کوئی جائے وہ دستار بکلوس لگائے۔ مہمان اس سے مستثنیٰ تھے اور بغیر دستار بکلوس حاضر ہونے کی اجازت ایک طرح کا اعزاز خیال کیا جاتا تھا۔ میرا موٹر [illegible]ی تک گیا۔ میرے ۱۶ جون ۴۳ء کے روزنامچے میں درج ہے۔

سرکار نے علالت مزاج کی وجہ سے ندی باغ میں یاد فرمایا۔ میں نے موٹر سے اترتے ہی دیکھا کہ تمام کمرے برآمدے اور راہداریاں مختلف قسم کے سامان سے بھری پڑی ہیں۔ بکس۔ صندوق۔ بستے۔ پوٹلے۔ جملہ اقسام کی چیزیں انہی کے ساتھ بوتلیں اور مرتبان رکھے ہوئے ہیں۔ ان پر گرد جمی ہوئی ہے۔ مکڑیوں کے جالے لگے ہوئے ہیں۔ کبوتروں کی بیٹ پڑی ہوئی ہے خدا جانے کتنے عرصہ سے یہ چیزیں اپنی جگہ پر رکھی ہوئی ہیں۔ آگے بڑھا تو ایک

بہت بڑا بکرا کھڑا ہوا پتے کھا رہا تھا۔ اس موقع پر اس شانِ نزول کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ (بعد کو معلوم ہوا کہ اس بکرے کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اس وجہ سے وہ بطور پنشن خوار یہاں رہتا ہے) یہ پہلا موقع تھا جو بغیر دستار بکلوس کے حاضر ہوا۔ چھوٹے برآمدے میں سرکار ایک کرسی پر بیٹھے تھے اور سامنے ایک کرسی گول سیٹ کی رکھی ہوئی تھی جس پر سلام کر کے میں بیٹھ گیا۔ میں نے آداب کے بعد امام ضامن پیش کیا۔ سرکار بہت کمزور نظر آتے تھے۔ فرمانے لگے کہ مجھے دست بھی آتے ہیں اور سو بخار بھی ہے۔

میں نے دیکھا کہ اس برآمدے میں بھی بہت سے مقفل سربمہر صندوق اور سربمہر زرد رنگ کی تھیلیاں رکھی ہیں۔ مجھے خیال آیا کہ جس طرح یہ سامان رکھا ہوا تھا۔ اس میں وقتاً فوقتاً چوری ہونے کا ضرور امکان تھا۔

۱۹ جون ۴۳ء میں نے نواب بہادر یار جنگ کو بلایا۔ علی یاور جنگ اور غلام محمد مرحوم بھی تھے۔ سر اکبر حیدری کے زمانہ میں ایک ایسا تحریری معاہدہ ہو گیا تھا کہ قانون ساز جماعت میں اکیاون فیصدی مسلمان نشست پائیں گے۔ چونکہ ہندو صاحبان بجا طور پر اس تجویز کے خلاف تھے کوئی متفقہ قانون ساز جماعت کی تشکیل نہیں ہو سکتی تھی۔ میں یہ چاہتا تھا کہ وہ اس معاہدہ کو واپس دیدیں اور کوئی دوسری تجویز مسلمانوں کے تحفظ کے لئے قبول کر لیں۔ غلام محمد مرحوم نے مجھ سے کہا کہ جو تجاویز اس معاہدہ کی بجائے ہم نے بنائی ہیں۔ ان کے متعلق جو گفتگو میرے بعد غلام محمد اور بہادر یار جنگ سے ہوئی اس کا نتیجہ یہ تھا کہ کسی نئی تجویز کو اس معاہدے کے بجائے پسند نہیں کرتے۔ مسلمانوں کا اصرار درست نہ تھا گو اس انقلاب کے بعد اس پر بحث لاحاصل ہے۔ مسلمانوں نے ایسا نہ کیا ہوتا تو اس سے سیاسی اعتبار سے کیا فائدہ ہوتا۔ مگر اکثریت اور اقلیت کے آپس کے

تعلقات ضرور بہتر ہو جاتے۔

۲۴ رجون ۱۹۴۳ء آج صاحبزادے ذوالفقار جاہ کی پیدائش کے سلسلہ میں سرکار نے ایک لنچ بارہ بجے دیا۔ جس میں شرکت ہوئی۔ میں نے بچے کے واسطے کچھ چاندی کے برتن۔ کھلونے اور کپڑے بھیجے۔ جن کی مجموعی قیمت سترہ سو روپیہ تھی۔ اعلیٰ حضرت نے ایک بہت اچھا خط اپنی اور بیگم صاحبہ کی طرف سے شکریہ کا بھیجا۔

شام کو پھر حاضری کا موقعہ ملا۔ اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ یہ وائسرائے جاتے جاتے ان ریاستوں کے مستقبل کے متعلق کوئی اعلان کریں گے۔ میں نے عرض کیا کہ تین چار روز ہوئے میں نے یاددہانی کا خط انہیں لکھا ہے۔ فرمانے لگے

DID YOU HAVE THE COURAGE TO REMIND THE VICEROY.

میں نے کہا کہ اس میں ہمت کا کوئی سوال نہیں ہے۔ شام کو میں دہلی کے واسطے روانہ ہو گیا۔ اسی زمانہ میں حیدرآباد کے ایک اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی کہ بعض جاگیردار دہلی میں ریاست حیدرآباد کے خلاف کچھ سازش کر رہے ہیں اور ایک جاگیردار کا نام K سے شروع ہوتا ہے۔ اعلیٰ حضرت نے بتایا کہ وہ جاگیردار جن کی طرف اخبار میں اشارہ ہے کمال یار جنگ مرحوم تھے۔ سرکار نے فرمایا کہ دہلی میں اس کے متعلق معلوم کروں اور اگر ہو سکے تو اس کا مداوا کروں۔

میں یکم سے ۳ جولائی تک دہلی رہا اور SIR KEINETH FITZ سے ملا جو سکریٹری پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ میں تھے۔ میں نے ان سے ذکر کیا کہ حیدرآباد کے ایک اخبار میں خبر شائع ہوئی ہے کہ بعض جاگیرداروں نے آپ سے ریاست کی شکایت کی ہے کہ چونکہ یہ جاگیریں مغلیہ سلطنت کے زمانہ میں انہیں ملی ہیں۔ ان کا تعلق بجائے نظام کے حکومت ہند سے ہے۔

کے جواب میں انہوں نے صاف صاف تو کچھ نہ کہا مگر ان کے طرز بیان سے میں نے نتیجہ نکالا کہ خبر بے اصل نہ تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ جاگیرداروں کا بیان غلط ہے۔ تاریخ سے یہ ظاہر ہے کہ جس زمانہ میں آصف جاہ اول نے حیدرآباد اپنا دارالسلطنت بنایا۔ مغلیہ سلطنت اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ بادشاہ کی حکمرانی دہلی ہی تک محدود تھی۔ لہذا حیدرآباد میں ان کا جاگیر دینے کا کیا سوال ہے۔ بعض اوقات اظہار وفاداری کے طور پر دہلی سے بھی حکم منگا لیا ہوگا۔ لیکن حقیقت میں حکومت آصف جاہ کی تھی۔ سر کنیتھ فٹز نے کہا کہ ہمیں جاگیرداروں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ سوائے چند ایسے جاگیرداروں کے کہ جن کی ضمانت برٹش گورنمنٹ نے کی ہے۔ گو ایسا ہے بعض ایسے جاگیردار تھے کہ جن کی جاگیر کی ضامن برٹش حکومت تھی۔

۵ جولائی ۱۹۴۳ء کو صبح حیدرآباد پہنچا اور باغ عامہ میں اسی وقت حاضر ہوا۔ وہاں عرب بے قاعدہ فوج کا ایک حصہ تھے حاضر ہو کر نظام سلامی دیتے تھے اور عربی زبان میں دعا دیتے تھے۔ شب کو سرکار کی طرف سے بہت بڑا ڈنر ہوتا تھا۔ جس میں کھانے کے بعد نذریں دی جاتی تھیں۔ پہلی نذر سالگرہ کی میں نے پیش کی۔ اس کے بعد درجہ بدرجہ نذریں پیش ہوئیں۔ عام نذر ایک اشرفی اور سات روپیہ ہوتی تھی۔ اس روز صدر اعظم باب حکومت عرضداشت بھی پیش کرتا تھا۔ اتفاق سے اس تاریخ کی عرضداشت کی نقل "صبح دکن" اخبار کے پرچہ میں تھی جسے بلفظہٖ نقل کرتا ہوں۔ تاکہ اس زمانے کے آداب اور طرز تحریر کا اندازہ ہو جو اب ایک فسانہ ہے جو عنقریب [illegible] ہو جائیگا۔

بہ پیشگاہ بندگان اعلیٰ حضرت پیر و مرشد جہاں پناہ ظل سبحانی سلطان العلوم مدظلہ العالی خلد اللہ ملکہٗ۔

بعد آداب آستانہ بوسی۔ مؤدبانہ عرض ہے کہ

عالم پناہ۔

یوں تو بادشاہوں کی سالگرہ منانے کا رواج ہر قوم اور ہر ملک میں زمانہ دراز سے چلا آرہا ہے۔ جس کو رعایا برابر رسماً مناتی ہی رہتی ہے۔ مگر ایسا بادشاہ جس کے قلب انسانی میں رعایا کی ہمدردی بھری ہو جس کے دل میں انسانیت کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہو جو انسان تو انسان حیوان کی مصیبت سے بھی متاثر ہوتا ہو جس کی علالت سے ملک بے چین ہو جاتا ہو جس کی سواری نہ نکلنے سے اس کی رعایا پریشان ہو جاتی ہو۔ اسکی سالگرہ حقیقت میں ایسی سالگرہ ہے جس پر اہل ملک جتنی بھی خوشیاں منائیں کم ہے لہذا آج اہل ملک خلوص قلب سے دعائیں مانگ رہے ہیں کہ خدا ارض و سما ایسے مالک مجازی کو صد و سی سال سلامت با کرامت رکھے جس کے فیوض و برکات اہل ملک خصوصاً اور مسلمانان ہند عموماً مستفید ہوتے ہیں اور جس کی رہبری ان کے لئے ایک نعمت ہے۔

فدوی جاں نثار اس مبارک موقعہ پر اپنی۔ کونسل اور اہل ملک کی جانب سے بصد ادب ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرنے کی عزت حاصل کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ خدا حضرت پیر و مرشد اور شاہزادگان والا شان و شہزادیان فرخندہ فال کو دیر گاہ سلامت رکھے اور وابستگان دولت کو اس طرح سالگرہ مبارک منانے کا موقعہ مدتوں ملتا رہے۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد۔ زیادہ حد ادب۔

معروضہ ادب یکم رجب المرجب ۱۳۶۲ھ

عرضی

فدوی جاں نثار

احمد سعید

۱۳ جولائی ۴۳ء کو میں [illegible] والاشان ہز ہائینس پرنس آف برار

میں حاضر ہوا۔ مجھے الگ لیجا کر فرمایا کہ ان کی سول لسٹ میں اضافہ کر دیا جائے جہاں تک مجھے یاد ہے ان کی سول لسٹ پچیس ۲۵ ہزار روپیہ ماہوار تھی۔ میں نے عرض کیا کہ میں نے وزراء کی ایک سب کمیٹی اسی مسئلہ پر غور کرنے کے واسطے مقرر کی ہے وہ مجھے رپورٹ دیگی۔ لیکن خود پرنس کو بھی بعض چیزوں کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔ مجھے دہلی میں ہز ہائینس جام صاحب سے یہ معلوم ہوا کہ آپ کی طرف سے بہت معمولی لوگ اس کام پر متعین ہیں کہ آپ کے واسطے قرضہ لائیں۔ اس سے بدنامی ہو رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ میرے ایجنٹ نہیں ہیں۔ بلکہ چھوٹے پرنس کے ہیں اور وہ اپنے آپ کو پرنس آف حیدرآباد کہتے ہیں۔ پھر کچھ اور خانگی مسائل پر گفتگو کر کے چلا آیا۔

اسی روز بہادر یار جنگ مرحوم مجھ سے ملے۔ جو نمائندہ جماعت بنانے کے سلسلہ میں اُن سے کہا تھا کہ سر اکبر حیدری کے زمانہ کا دیا ہوا معاہدہ واپس کر دیں۔ اس پر انہوں نے کہا کہ علی یاور جنگ کی تجویز کو تو مسلمان ماننے کو تیار نہیں ہے مگر ایک اور میٹنگ کرونگا اور بجائے اس معاہدہ کے دوسری تجویز پیش کرونگا کہ اس پر غور دوبارہ کیا جائے۔ وہ تجویز یہ تھی کہ مسلمان اکبر حیدری کے معاہدہ کو واپس کر دیں مگر رائیوں میں انہیں مساوات دیدیجائے بغیر مخلوط انتخاب ہو۔

پھر کہنے لگے کہ اب تیسری بار مجھے پھر وزارت کا OFFER کیا گیا ہے کیا آپ سے اور سرکار سے ایسا ذکر آیا تھا۔ میں نے کہا کہ آپ کا نام لیکر کسی نے ذکر نہیں کیا۔ لیکن یہ اکثر عرض کیا ہے کہ حیدرآباد کی گورنمنٹ اگر (RESPONSIBLE) نہ ہو تو (RESPONSIVE) تو ہو اور پبلک نمائندوں کو موقعہ ملنا چاہئے کہ وہ حکومت میں حصہ لے سکیں۔ بہادر یار جنگ مرحوم نے مجھے نام نہیں بتایا کہ انہیں وزارت کی دعوت کس نے دی۔ گمان کیا کہ میں نے اس زمانہ میں سنا تھا غالباً غلام محمد صاحب مرحوم

نے ان سے ایسی بات چیت کی۔ اس لئے کہ نظام تو ایسا نہیں کر سکتے تھے کہ بغیر میرے مشورہ کے کسی کو وزارت کی دعوت دیں۔ چونکہ حکومت ہند سے بھی دریافت کرنا ہوتا ہے اس واسطے صدر اعظم کا اتفاق کرنا ضروری تھا۔

میں چاہتا تھا کہ عوام کے قائدین اور لیڈر بھی شریک وزارت ہوں مستقبل کا چہرہ ہنوز بہت غبار آلودہ تھا مگر آنے والے تغیرات کی جھلکیاں نظر آتی تھیں۔ مگر جو کچھ ہوا وہ میرے وہم و گمان سے بھی زیادہ ہوا۔ مجھے ایسے انقلاب عظیم کا وہم و گمان بھی نہ تھا ہاں یہ یقین تھا کہ جب حیدرآباد کے چاروں طرف خود مختار جمہوری حکومتیں ہونگی تو حیدرآباد کے لوگ بھی صبر نہ کر سکیں گے۔

۱۰ جولائی ۴۳ء کو سرکار میں حاضر ہوا۔ سال نو میں برٹش خطابات کے متعلق گفتگو رہی۔ ایڈورڈسن (پولیس کا ہیڈ) کے C.I.E. سے سرکار کو اتفاق تھا۔ مہدی یار جنگ وزیر تعلیمات سے اتفاق تھا۔ مگر یزدانی مرحوم (ناظم آثار قدیمہ) کے تمغہ سے اتفاق نہ تھا۔ اور فرمایا کہ بڑے جاگیرداروں کو یہ خطاب نہ ملے اور ناظم آثار قدیمہ کو ملے۔ یہ ٹھیک نہ ہوگا۔ پھر میں نے اس خط کی کاپی جو میں نے لارڈ لنلتھگو کو لکھا تھا اور ان کا جواب پیش کیا ان کے جواب سے تو خوش تھے مگر مجھ سے بار بار کہتے تھے کہ تم ولیعہد کی ڈیر لکھتے ہو۔ میں نے کہا جی ہاں۔ تو فرمایا کہ یہ حق تو ریاست کے رئیس کو دیا گیا ہے۔ میں نے کہا کہ میں تو اسی طرح لکھتا ہوں۔

۱۱ جولائی ۴۳ء کو سرکار میں حاضری ہوئی۔ میں نے عرض کیا کہ چونکہ جاگیردار کیوں نہ سرکار میں ایک معروضہ داخل کریں کہ وہ حضور والا کے بزرگوں کو اپنا محسن اور مربی تصور کرتے ہیں اور اخبارات میں جاگیرداروں کے متعلق جو لکھا گیا ہے وہ اسے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے۔ سرکار نے اسے پسند کیا اور فرمایا کہ راجہ دھرم کرن کے

سے یہ کام مناسب ہوگا۔

راجہ دھرم کرن میری کابینہ کے ایک ممبر تھے۔ نظام کے بڑے وفادار تھے۔ یہ ان چند خاندانوں میں سے ایک خاندان تھا کہ جو دہلی سے آصف جاہ اول کے ساتھ آئے اور یہ اپنے آپ کو "آصف جاہی" کہتے تھے۔

پھر سر جگدیش پرشاد اور سر سری واستوا کا ذکر آیا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین پر بھی گفتگو ہوئی اعلیٰ حضرت انہیں پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ انہیں انگریزوں کا طرفدار سمجھتے تھے۔ والیان ملک عام طور پر اور حضور نظام خاص طور پر انگریزی حکومت کی مداخلت کی وجہ سے حکومت ہند سے دل میں ناخوش رہتے تھے۔ انہیں یہ خیال تک نہیں آتا تھا کہ انگریزی حکومت ہی بحیثیت والیان ملک ان کی قیام و بقا کی ضامن تھی۔ میں یہ چاہتا تھا کہ اعلیٰ حضرت ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم کا کوئی منصب مقرر کر دیں۔ جو بطور جاگیر نسلاً بعد نسلاً ملا کرے مگر نظام نے منظور نہیں کیا۔

۱۵ جولائی ۴۳ء کونسل کے بعد میں گرگسن سے جو پولیس اور جنرل ایڈ منسٹریشن کے صیغہ کا وزیر تھا۔ باتیں کرتا رہا۔ میرے روزنامچہ میں درج ہے "اشفاق کے واسطے یہ طے ہو گیا کہ انہیں ڈپٹی سکریٹری ہوم ڈپارٹمنٹ کر دیا جائے۔ گو مجھے کام میں دقت ہوگی مگر اشفاق کو بہت اچھی جگہ مل جائے گی۔"

اشفاق پولیس میں۔ ڈی۔ ایس۔ پی۔ تھے۔ یہ نواب فخر یار جنگ مرحوم کے بیٹے تھے جو میرے زمانہ سے پہلے وزیر مال حکومت حیدرآباد میں تھے میں نے انہیں بطور A.D.C. اپنے اسٹاف میں لیا تھا۔ یہ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔ نہایت ذی ہوش محنت کش اور وفا شعار شخصیت کے مالک تھے۔ مجھے ان سے حیدرآباد کے قیام میں بڑی مدد ملی ان کی یاد محبت اور تشکر کے ساتھ میرے دل میں ہمیشہ قائم رہیگی۔

پھر کچھ بہادر یار جنگ مرحوم کا ذکر آیا۔ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ مرحوم اردو میں بہت اچھی تقریر کرتے تھے۔ روزنامچہ کی عبارت یہ ہے "میں نے گرگسن سے کہا کہ اگر اس وقت گورنمنٹ آف انڈیا نے یہ چاہا کہ انہیں لیگ میں جانے کی اجازت دی جائے تو کیا پوزیشن ہوگی۔ انہیں (بہادر یار جنگ کو) یہ کہنے کا موقعہ ہوگا کہ اپنی ضرورت کے واسطے توجہ سے تقریر کراتے ہیں اور ویسے پابندی لاحق کرتے ہیں۔ گرگسن نے کہا کہ اس میں جناح کی بھی ضرورت ہے کہ لیگ (الکشن) جیتے۔ تو میں نے کہا کہ ویسرائے کو بھی تو اس کی ضرورت ہے کہ اورنگ زیب خاں کی منسٹری جیتے اور آج آپ کو جناح کا اتنا خیال ہو گیا اور جب انہوں نے لیگ میں تقریر کرنے کو کہا" تو آپ خلاف تھے۔ میں متحیر رہ گیا جب آج نیم سرکاری سے مجھے معلوم ہوا کہ نظام نے خود بہادر یار جنگ سے وزارت کے متعلق کہا۔ مگر انہوں نے انکار کیا۔

میرے زمانہ قیام میں جہاں تک یاد ہے، تین بار اس کا موقعہ ملا جب کبھی محل میں کوئی صاحبزادی یا صاحبزادہ پیدا ہوتا۔ میں ایک عرضداشت اور چند تحائف پیش کرتا اور نظام ایک ذاتی گرامی نامے سے مجھے سرفراز کرتے۔

۱۵ جولائی ۱۹۴۳ء سرکار میں حاضر ہوا۔ منجملہ اور باتوں کے میں نے اس کا بھی ذکر کیا کہ ریزیڈنٹ یہ دریافت کر رہا تھا کہ مہاراجہ کشن پرشاد کی جاگیر کا قضیہ طے ہوا یا نہیں۔ مناسب ہوگا کہ اس پر جلد حکم صادر فرمایا جائے۔ چنانچہ خواجہ پرشاد کو وارث تسلیم کرنے کے متعلق دفتر پیشی نے مجھے اطلاع دی کہ رمضان یا شوال کے مہینہ میں فرمان جاری ہو جائیگا۔

مہاراجہ کشن پرشاد ایک اعلیٰ ترین شخصیت کے حامل تھے۔ حیدرآباد میں ایسی شخصیت دوسری نہ تھی۔ یہ ایک بڑے جاگیردار تھے۔ دو بار

تک مجھے یاد ہے صدر اعظم بھی رہے۔ ان کی فیاضی اور سخاوت مشہور تھی۔ صوفی مزاج تھے۔ درویشوں کے بڑے معتقد تھے۔ اجمیر شریف اکثر حاضر ہوتے تھے۔ خلق اور انکسار کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ وہ ہر مذہب کا یکساں احترام کرتے تھے۔ اُن کی ہندو بیویاں بھی تھیں اور ایک مسلمان بھی تھیں۔ جن کا نام غوثیہ بیگم تھا۔ اُن کے بچے ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ ان کے گھر میں دونوں مذاہب کے تہوار ہوتے تھے۔ ہولی۔ دیوالی۔ جنم اشٹمی جس اہتمام سے منائی جاتی تھیں اُسی اہتمام سے عید۔ بقرعید اور شب برات منائی جاتی تھی۔ آج کی زبان میں یہ صحیح معنوں میں سیکولر تھے۔

ان کی وراثت میں دشواری یہ تھی کہ ان کے بڑے بیٹے سب مسلمان تھے اور خواجہ پرشاد سب سے چھوٹے بیٹے ہندو تھے۔ لیکن یہ جاگیر ایک ہندو خاندان کی تھی۔ لہذا خواجہ پرشاد کو وارث جاگیر مانا گیا اور دوسرے بیٹوں کے حسب رواج جاگیر سے تنخواہیں مقرر ہو گئیں۔ ان بیٹوں میں ایک بیٹے اعلیٰ حضرت کے داماد بھی تھے۔

یکم اگست ۱۹۴۳ء کو ریزیڈنٹ فون کر کے خود میرے یہاں آگئے۔ اول تو مجھے مدعو کیا کہ میں اُس ڈنر میں شریک ہوں جو وہ شہزادی درشہوار کے لئے دینگے جس میں وہ انہیں قیصر ہند میڈل حکومت کی طرف سے دینگے۔ یہ تمغہ سماجی خدمات کے واسطے دیا جاتا تھا۔

ان کی خواہش تھی کہ میں آراموداآئنگر، زین اور علی یاور جنگ کو وزارت میں لوں۔ زین کے متعلق تو میں خود سرکار سے کہہ چکا تھا کہ سید عبدالعزیز کے بجائے انہیں لیا جائے۔ لیکن دوسرے حضرات کے متعلق میں نے کہا کہ غور کرونگا۔

۱۵ اگست ۱۹۴۳ء کو میں ریزیڈنٹ سے ملا۔ ایک بات مجھے بہت سبق آموز اور دلچسپ معلوم ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ شہزادی نیلوفر پرنس معظم جاہ

مشورہ کرلوں۔ چنانچہ میں نے اُن سے ملکر اس پر راضی کرلیا کہ اگر ہم خود سزا
دیدیں گے تو وہ مقدمہ واپس لے لیں گے۔ ریزیڈنسی سے واپس آکر یونیورسٹی
کونسل کی میٹنگ میں یہ طے ہوا کہ مفرور لڑکے سے اپیل کی جائے کہ وہ خود
حاضر ہو جائے۔ ورنہ یونیورسٹی اُسے سزا دیگی۔ اور اس واقعہ پر اظہار افسوس
کیا۔ پی۔ وی۔ سی نے یہ تجویز پیش کی کہ اگر لڑکے واپس ہوں تو انہیں اس
وقت تک نہ لیا جائے جب تک وہ فرداً فرداً معافی نہ مانگیں اور D.P.I.
بھی اسے پسند کر رہے تھے۔ سوائے بیگم زین یار جنگ مرحوم کے کسی نے بھی
یہ نہ کہا کہ یہ قابل عمل نہیں۔ مجھے اتفاق نہ تھا۔ D.P.I. کا یہ خیال تھا کہ جتنے
لڑکے ان کے اسکولوں سے متعلق اس شورش میں شریک ہیں انہیں رسٹی
کیٹ کردیا جائے۔ میں نے پوچھا کہ اُن کی کیا تعداد ہوگی۔ کہنے لگے آٹھ سو
ہیں میں نے اس تجویز کو بھی مسترد کردیا۔

۲۴ر نومبر ۴۳ء کی شب کو بہادر یار جنگ مرحوم میرے پاس آئے۔
مسٹر گرگس بھی بیٹھے تھے۔ انھوں نے یہ کہا کہ اگر میں خود لڑکوں کو خطاب کروں
تو وہ مفرور لڑکے کو حاضر کردیں گے۔ میں نے کہا کہ اگر آپ کو یقین ہے کہ
وہ میرے کہنے پر ملازم لڑکے کو حاضر کردیں گے تو میں انہیں خطاب
کرنے کو تیار ہوں۔ چنانچہ دوسرے روز ۲۵ر تاریخ کو میں نے لڑکوں کے
سامنے تقریر کی اور ملازم لڑکے کو حاضر کردیا گیا۔ میرے روزنامچہ میں یہ عبارت
درج ہے "خدا کا شکر ہے اس وقت تو یہ معاملہ ختم ہوگیا"۔ لیکن میں نے
اس کا احساس کیا کہ طلباء میں ڈسپلن کا فقدان تھا۔ ان نوعمر طلباء میں تہذیب
نفس اور احساس فرق مراتب کی کمی تھی جو حیدرآباد کے مستقبل کے واسطے مضر
ثابت ہوگی۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ اساتذہ کو بجائے محبت طلباء سے نفرت
ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ گورنمنٹ انہیں سزا دے اور سخت سے سخت سزا دے
۴ر دسمبر ۴۳ء کو میں پھر ریزیڈنٹ سے ملا۔ نواب علی یاور جنگ بھی ساتھ

تھے۔ اور باتوں کے بعد یونیورسٹی کے لڑکے کا ذکر آیا۔ انھوں نے اس پر رضامندی
دیدی کہ سکندرآباد کی عدالت میں اس لڑکے کو نیک چلنی کی ضمانت لیکر
چھوڑ دے اور ہم ایک سال کے واسطے اسے یونیورسٹی سے نکالدیں۔
پھر وہ بہادر یار جنگ مرحوم کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ میں انکی صفائی
کے متعلق کہتا رہا۔ ریزیڈنٹ نے کہا کہ وہ بہادر یار جنگ سے ملنا چاہتے
ہیں۔ میں نے کہا کہ ایک روز میں انہیں اور بہادر یار جنگ کو چائے پر
بلالوں گا۔

۵ر دسمبر ۴۳ء کو میں پھر ریزیڈنٹ سے ملا اور یہ طے کرلیا کہ یونیورسٹی
کے اس لڑکے سے جو ملازم تھا نیک چلنی کے مچلکہ بھی نہ لئے جائیں اور ایسے
یوں ہی چھوڑ دیا جائے۔ ریزیڈنٹ نے پھر سے کاظم یار جنگ کی شکایت
کی کہ وہ برٹش حکومت کے خلاف باتیں کرتے ہیں۔ میں اُن کی صفائی
میں کہتا رہا۔ اُن سے معلوم ہوا کہ نواب ذوالقدر جنگ نے اُن سے کہا۔
آج شب کو بیگم شاہ نواز کا ڈنر تھا۔ یہ میری مہمان تھیں میں نے
ریزیڈنٹ کو بھی مدعو کیا تھا۔ ڈنر کے بعد کہنے لگے کہ کسی لیڈی کے سامنے
یہ کہنا مشکل ہے کہ بہت سے کام ایسے ہیں کہ جنہیں خواتین بجز مردوں کے
نہیں کرسکتیں پھر کہنے لگے کہ بیگم شاہ نواز اُن سے یہ کہہ رہی تھیں کہ ڈپلو
میٹک کام عورتیں مردوں سے بہتر کرسکتی ہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے میں
نے کہا کہ ہاں یہ سچ ہے بشرطیکہ دوسری حکومت اپنی ڈپلومیٹک ملازمت
میں فقط مردوں ہی کو رکھے اور اگر دونوں طرف سے عورتیں ہی ہوئیں
تو زلف پیچاں کی تمام پیچیدگیاں بین الاقوامی تعلقات میں اس طرح
پیدا ہونگی کہ سلجھانا مشکل ہو جائے گا اس پر بہت دیر تک ہنستے رہے۔
بیگم شاہ نواز نہایت ذکی اور ذی ہوش خاتون ہیں۔ سر میاں محمد شفیع مرحوم
کی صاحبزادی ہیں گول میز کانفرنس کی ممبر تھیں انگریزی اور اردو میں بہت

اچھی تقریر کرتی تھیں۔ پاکستان بننے کے بعد ملنا نہیں ہوا مجھ پر بہت کرم فرماتی تھیں۔ خدا انہیں ہمیشہ خوش رکھے۔

۱۲ دسمبر ۱۹۴۳ء کو میں نے ریزیڈنٹ کو چاء پر بلایا اور بہادر یار جنگ مرحوم کو بھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ اُن میں کیا گفتگو ہوئی۔ میں ٹینس کھیلتا رہا مگر بہادر یار جنگ بہت ممنون تھے اور کہنے لگے کہ جتنا رابطہ مقامی حضرات سے میں نے پیدا کیا اس سے قبل کبھی نہیں ہوا۔

بہادر یار جنگ مسلمانان حیدرآباد کے حقیقتاً لیڈر تھے اُردو کی تقریر بہت پر اثر ہوتی تھی بہت معاملہ فہم اور دور اندیش تھے اگر اُن کی موت نے حیدرآباد کو اُن کی خدمات سے محروم نہ کیا ہوتا تو اتحاد المسلمین کو وہ ایسی غلط پالیسی اختیار نہ کرنے دیتے کہ جس کا انجام پولیس ایکشن ہوا۔

۱۱ دسمبر ۱۹۴۳ء کو مجھ سے ریزیڈنٹ نے کہا۔ کیا یہ سچ ہے کہ علی یاور جنگ کو وزیر بنانے کے لئے سر عقیل نے بیس ہزار دئے اور نواب ظہیر یار جنگ سے پچاس ہزار مانگے جا رہے ہیں۔ میں نے کہا۔ میرے خیال میں یہ خبریں بے بنیاد ہیں۔

اسی روز اتفاق سے میں نے نواب ذوالقدر جنگ کو کھانے پر بلایا تھا۔ دوران گفتگو اُن سے معلوم ہوا کہ انہوں نے ریزیڈنٹ سے کہا تھا کہ بیس ہزار علی یاور جنگ کی وزارت کے واسطے اور پچاس ہزار نواب ظہیر یار جنگ کی وزارت کے واسطے مطلوب ہیں۔ اُنہوں نے یہ بھی ریزیڈنٹ سے کہا کہ سرکار ریزیڈنٹ کو پسند نہیں کرتے۔ خدا رحم فرمائے ان لوگوں کی عجیب حالت ہے۔ سرکار کو متنبہ کرنا بھی دشوار۔ جو عرض کیا جائے وہ ہر پر ظاہر ہو جاتا ہے اور فوراً مشتہر ہو جاتا ہے۔

۲۲ دسمبر ۱۹۴۳ء کو مہاراجہ کپورتھلہ آئے۔ میں انہیں اسٹیشن پر لینے گیا شاہ منزل میں میرے ہی پاس مقیم ہوئے شب کو میرے ساتھ ڈنر پر

ہوئے۔ ۲۳ دسمبر کو اعلیٰ حضرت نے کنگ کوٹھی میں لنچ دیا جس کے بعد فوٹو لیا گیا۔ لنچ کے بعد میں نے یہ عرض کیا کہ گرانی کی وجہ سے سرکار نے شاہزادگان کی سول لسٹ میں ڈھائی ہزار روپیہ ماہوار اضافہ پرنس اعظم جاہ اور معظم جاہ کے واسطے منظور فرما لیا تو اس موقع پر گرانی کا کچھ الاونس بسالت جاہ کے لئے بھی منظور فرمایا جائے یہ اعلیٰ حضرت کے سب سے چھوٹے بھائی ہیں مگر سرکار نے منظور نہیں کیا۔ سرکار کے فرمانے کا منشاء یہ تھا کہ بسالت جاہ کی ہماری سول لسٹ کے سلسلہ میں حکومت ہند سے یہ طے ہو گیا ہے کہ رقم مقررہ سے زیادہ کے وہ مستحق نہیں ہیں جہاں تک مجھے یاد ہے انہیں پانچ ہزار روپیہ ماہوار ملتے تھے یہ غالباً نظام مرحوم میر محبوب علی خاں کے انتقال کے بعد ۱۹۱۱ء یا ۱۹۱۲ء میں حکومت ہند سے طے ہوا ہوگا مجھے افسوس ہوا۔ سوال حق کا نہ تھا یہ تو فراخدلی اور صلہ رحمی کا سوال تھا۔

مہاراجہ کپورتھلہ بڑی زبردست شخصیت کے حامل تھے وہ اُردو اور انگریزی دونوں میں بہت اچھی تقریر کرتے تھے اور فرینچ تو بالکل اہل زبان کی طرح بولتے تھے۔ میں ایک بار کپورتھلہ اُن کے پاس مقیم تھا۔ اپنے محل کی مجھے خود سیر کرا رہے تھے۔ اُن کی ایک بیوی اُندلسی تھیں جن کی تصویر مجھے دکھائی تصویر پر مہاراج کے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ شعر تھا۔

آفاقہا گردیدہ ام ۔ مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

میرے اوپر بہت کرم فرماتے تھے۔ اُن کے صاحبزادے مہاراجکنوار امرجیت سنگھ کو جب میں یو۔پی میں ہوم ممبر تھا حکومت کی کابینہ میں بحیثیت وزیر لینے میں مدد دی تھی مہاراج وسیع النظر تھے۔ کپورتھلہ میں اُن کی بنائی ہوئی سنگ مرمر کی مسجد، گردوارہ اور مندر آج تک اس کے شاہد ہیں کہ وہ فرقہ وارانہ تنگ نظری سے متاثر نہ تھے۔ مہاراجہ شام کو مرغابی کے

۱ر فروری ۱۹۴۴ء کو ریزیڈنٹ نے مجھ سے کہا کہ بہادر یار جنگ اُن سے ملے اور دفترِ پیشی کی بہت شکایت کی۔ کاظم یار جنگ کی شکایت حیدرآباد میں عام تھی مگر نظام کو اتنا بھروسہ اُن پر تھا کہ انہیں علیحدہ کرنے کو تیار نہ تھے۔ مجھے کئی بار ایسا اتفاق ہوا کہ نظام کسی تجویز کے خلاف تھے اور حکومت اُسے ضروری خیال کرتی تھی۔ میں نے کاظم یار جنگ کو بلا کر کہا تو دو چار روز میں سرکار کا فرمان آ گیا۔

ریزیڈنٹ بجا طور پر اس طرف توجہ دلاتے تھے کہ پبلک کے نمائندوں کو بھی گورنمنٹ میں جگہ دی جائے مگر سرکار اسے دل سے ناپسند کرتے تھے۔ والیانِ ملک عام طور پر اسے ناپسند کرتے تھے لیکن آج یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر تمام والیانِ ملک نے فیڈریشن میں شرکت کر لی ہوتی اور رائے عامہ کے نمائندوں کو شریکِ حکومت کر لیا ہوتا تو ممکن ہے کہ ان کی رعایا اس انقلاب میں اُن کی محافظ بنجاتی۔

ریزیڈنٹ آر امود آئینگر کو چاہتے ہیں کہ میں گورنمنٹ میں لوں۔ مجھے اتفاق ہے۔ یہ ایک تجربہ کار وکیل ہیں۔ بہت ذی ہوش اور معتدل پالیسی کے حامی ہیں۔ سرکار کو راضی کرنا ہوگا۔ میں نے ریزیڈنٹ سے کہا کہ مسلمانوں میں بہادر یار جنگ اس قابل ہیں کہ اُن کو گورنمنٹ میں جگہ دی جائے۔ انہوں نے کہا کہ اس میں جلدی نہ کی جائے وہ دہلی سے مشورہ کریں گے۔

۲ر فروری ۱۹۴۴ء گونڈا کے ہاں (جو نظام ریلوے کے جنرل منیجر تھے) ڈنر تھا۔ میں اور ذرائع سے بھی سُن رہا تھا مگر آج گرگسن نے مجھ سے کہا کہ غلام محمد نے بہادر یار جنگ سے کہا کہ وہ اُن کے واسطے وزارت کے تقرر کی کوشش کریں گے۔ گرگسن اس پر بہت برہم تھا کہ برٹش گورنمنٹ کے ملازم کو جسے عارضی طور پر ریاست کو دیا گیا ایسی مداخلت اور ایسے وعدے کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

۳ر فروری ۱۹۴۴ء کو سرکار میں حاضر ہوا۔ پبلک کے نمائندے حکومت میں لینے کے متعلق گفتگو رہی۔ نظام فرمانے لگے کہ اس سے پہلے ریزیڈنٹ کے زمانہ میں یہ طے ہو چکا ہے کہ ایسی تبدیلی جنگ کے بعد کی جائے۔ پھر فرمایا کہ بہادر خاں کو ریزیڈنٹ نے کیوں بلایا۔ مجھ سے تو کہا تھا کہ میں انہیں انٹرویو نہیں دے سکتا۔ میں نے کہا کہ بہادر خاں کی خواہش پر بلایا ہوگا۔ اُسی روز دوپہر کو بہادر خاں (بہادر یار جنگ) مجھ سے ملنے آئے۔ ریزیڈنٹ سے جو بات چیت ہوئی تھی اُس کا ذکر کرتے رہے۔ پھر مجھ سے کہا کہ سرکار نے مقصود علی خاں (سرکاری طبیب) کو اُن کے پاس بھیجا تھا۔ وہ یہ پیام لائے تھے کہ ریزیڈنٹ بہادر یار جنگ سے ملنے کو تیار نہ تھے۔ بہادر یار جنگ نے جو خط انٹرویو ریزیڈنسی سے آیا تھا وہ مقصود علی خاں کو دکھایا اور اس پر افسوس کرتے رہے کہ سرکار ایسی غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اُن کی بدگمانی صحیح نہ ہو۔ ریزیڈنٹ نے خود ملنے سے انکار کیا ہوگا۔ مگر بہادر یار جنگ کی خواہش پر ملاقات کی۔ باتوں میں اُن سے اس کی تصدیق ہو گئی کہ غلام محمد نے ان سے نہ صرف یہ کہا کہ وہ وزارت قبول کریں بلکہ یہ بھی کہا کہ فلاں فلاں محکمے انہیں دئے جائیں۔ مجھے بہت افسوس ہوا۔ یہ بحیثیت صدرِ اعظم میرا حق تھا کہ میں اپنی کابینہ میں جسے مناسب سمجھوں لوں۔ غلام محمد صاحب میرے لائے ہوئے تھے۔ مجھے اُن سے یہ توقع نہ تھی کہ بغیر میرے علم و اطلاع کے وہ یہاں کے کسی لیڈر سے ساز باز کریں گے۔ بہرحال یہ ایک پرانی کہانی ہے۔ آج اور خاصکر اُس آخری ملاقات کے بعد جو اُن کی علالت کے زمانہ میں پاکستان میں ہوئی۔ میرا دل علی گڑھ کے ایک بھائی کی محبت کی یاد سے پُر ہے اور اس کی جدائی کا صدمہ ہے۔

۵ر فروری ۱۹۴۴ء کو گرگسن آئے۔ سب سے پہلے تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ غلام محمد کی اس میں کیا مصلحت ہے کہ وہ بہادر خاں کو بڑھانا چاہتے

میں نے سرکار سے عرض کیا کہ انہیں چائے پر بلالیں۔ بہت پس و پیش کے بعد مان لیا لیکن سرکار اتنے متشکک المزاج تھے کہ فرمانے لگے کہ مجھ سے کیوں ملنے آ رہا ہے۔ میں کیا کہتا کہ برٹش حکومت کا کمانڈر ان چیف حیدرآباد آئے تو اُسے نظام سے ضرور ملنا چاہئے اور سرکار بھی کھانے یا چائے پر مدعو کرنا چاہئے۔

پھر رشید نواز جنگ کا ذکر کیا۔ اُن کا قصہ یہ تھا کہ رشید نواز جنگ سرکار کے داماد تھے۔ سلطان الملک امیر پائیگاہ کا انتقال ہو گیا۔ رشید نواز جنگ اُن کے پوتے تھے۔ تعلیم تربیت کے لحاظ سے اپنے خاندان میں ممتاز تھے۔ سرکار چاہتے تھے کہ امیر پائیگاہ انہیں بنایا جائے۔ سلطان الملک مرحوم کے بڑے بیٹے ابوالفتح خاں زندہ تھے وہ کہتے تھے کہ اسلامی قانون کے مطابق بیٹے کے ہوتے ہوئے پوتا محروم ہے۔ جاگیروں کی وراثت میں اسلامی قانون کی پابندی نہ تھی بلکہ رواج یہ تھا کہ نظام اُسی خاندان میں سے جسے چاہیں امیر پائیگاہ تسلیم کر لیں۔ تصور یہ تھا کہ نظام نے دوبارہ عطیہ دیا۔ ابوالفتح خاں کا وکیل اسلامی قانون پر استدلال کر رہا تھا۔ میں نے کہا قانون شریعت اگر نافذ کیا جائے تو پورا نافذ کیا جائے یعنی امیر پائیگاہ مرحوم کے جتنے بیٹے بیٹیاں اور بیویاں ہیں سب کو وراثت قانون شریعت کے مطابق ملے گی۔ تنہا ابوالفتح خاں کو کیسے ملے گی۔ چنانچہ رشید نواز جنگ کے متعلق سفارش کی گئی جس سے سرکار مطمئن ہو گئے۔ پھر سرکار نے فرمایا کہ اس کے موقعہ پر بہادر جنگ کی جاگیر واپس کر دی جائے ریزیڈنٹ سے کہ میری بھی یہی رائے ہے۔ میں نے کہا کہ سرکار کی پوزیشن بالکل صاف ہے سرکار نے جو کچھ کیا اپنے صدر اعظم کے مشورہ کے بعد کیا سرکار مطمئن ہو گئے۔

۱۶ مارچ ۴۷ء کو میں ریزیڈنٹ سے ملا۔ رشید نواز جنگ کو

امیر پائیگاہ بنانا اور بہادر جنگ کی واپسی جاگیر کے متعلق گفتگو کی۔ بعد کو کمانڈر ان چیف کے حیدرآباد آنے کا ذکر آیا۔ ریزیڈنٹ نے کہا کہ میں لطیفۂ راز تم سے کہتا ہوں کہ C. in C. اور پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ میں یہ جھگڑا ہے کہ C. in C. جس ریاست میں چاہتے ہیں جاتے ہیں اور جہاں چاہتے ہیں قیام کرتے ہیں پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ سے مشورہ نہیں کرتے آخر میں کہنے لگے۔ دہلی تو چاہتی ہے کہ تم یہاں رہو اور اگر تم اس پر تیار نہیں ہو تو وہ وہاں (EMPLOY) کریں۔ تمہاری کیا رائے ہے۔ میں نے وہی جواب دیا جو گرگسن سے ایک دو روز قبل کہہ چکا تھا جس کا منشا یہ تھا کہ مجھے کوئی دلچسپی نہیں جہاں میری خدمات مناسب ہوں حکومت ہند خود تجویز کرے چونکہ میرا تقرر تین سال کے لئے ہوا تھا اور اگست میں تین سال ختم ہوتے تھے تو دہلی اس پر غور کر رہی تھی کہ آئندہ صدر اعظم حیدرآباد میں کون ہو۔ حیدرآباد میں صالح حیدری مرحوم کا نام لیا جا رہا تھا۔ اخبارات میں مختلف خبریں آ رہی تھیں۔

۲۴ مارچ ۴۷ء کے اخبار نظام گزٹ میں نظام کا ایک فرمان شائع ہوا جس میں میری خدمات صدارت کو "پسندیدہ اور قابل قدر" الفاظ سے تعبیر کر کے یہ کہا گیا تھا کہ میرا تقرر تین سال کے واسطے نہیں بلکہ پانچ سال کے واسطے ہوا تھا جس میں ڈھائی سال باقی ہیں اور عوام کو متنبہ کیا تھا کہ جب تک نذری باغ (دفتر پیشی) یا باب حکومت سے کوئی خبر مصدقہ نہ ہو یقین نہ کریں۔ یہ فرمان یکایک آیا۔ بہرحال میں نے عرض داشت کے ذریعہ اظہار تشکر کیا اور سرکار کے حکم سے میری عرض داشت مع سرکار کے فارسی نوٹ کے۔ ۲۲ مارچ ۴۷ء کے صبح دکن اخبار میں شائع کر دی گئی جو حسب ذیل ہے۔

تھا۔ مجھے یہ پہاڑ بہت پسند آیا۔ موٹر آسانی سے ہر جگہ جا سکتی ہے۔ ریزیڈنٹ سے حسبِ ذیل گفتگو رہی۔ اس زمانہ میں ریلوے پر جنگ کی وجہ سے اتنا کام تھا کہ گورنمنٹ نے سیلون چلانا بند کر دیا تھا۔ میں نے کہا کہ پرنس آف برار، معظم جاہ، بسالت جاہ۔ اور مجھے اس حکم سے مستثنیٰ کیا جائے۔ برٹش گورنمنٹ نے منظور کر لیا۔ پھر عبداللہ خاں کسمنڈی کا ذکر آیا۔ انہوں نے مجھے اُن کا فائل دکھایا جس سے مجھے یقین ہو گیا کہ سرکار نے اُن کے متعلق ریزیڈنٹ کو خط لکھنے میں غلطی کی۔

پھر RAILWAY JURISDICTION اور سکندرآباد کی واپسی کا ذکر آیا۔ میں اسے عجلت چاہتا تھا۔ پھر انگریز افسران کے بجائے ہندوستانیوں کو مقرر کرنے پر میں نے اصرار کیا اور اس پر بہت طویل گفتگو رہی۔ ریزیڈنٹ نے کہا نواب صاحب میرے علم میں ہے کہ ایک مرتبہ نواب ولی الدولہ اور سر اکبر آنکھوں میں آنسو بھرے آئے اور اس پر زور دیا کہ یہاں کام بغیر انگریز افسروں کے نہیں چلے گا۔ بہر نوع مجھے امید ہے کہ DIRECTOR OF REVENUE آئندہ کوئی ہندوستانی ہو سکے گا۔

۲۹ جون ۱۹۴۲ء۔ ۵ جون کو میرے یہاں مسٹر راما مورتی کا ڈنر تھا۔ یہ مدراس کے گورنر کے مشیر تھے۔ دریائے تنگبھدرا میں بند لگا کر نہر نکالنے کا مسئلہ اور مدراس و حیدرآباد کے درمیان پانی کی تقسیم کا مسئلہ زیرِ بحث تھا۔ جس کا تصفیہ بخیر و خوبی ہو گیا۔ حیدرآباد کے نمائندے نواب علی نواز جنگ تھے جو انجینیر ہونے کے اعتبار سے بڑے بلند پایہ ماہرِ فن تھے۔

ڈنر کے بعد مجھے اطلاع ملی کہ بہادر یار جنگ۔ ہاشم علی خاں کے یہاں کھانے پر گئے تھے۔ کھانے کے بعد حقہ آیا جوں ہی اُس کا کش لیا۔

۲۰ اپریل ۱۹۴۲ء میں آج وائسرائے سے ملا۔ دہلی میں یہ عام خیال تھا کہ لارڈ ویول کی اپنی کوئی رائے نہیں ہے وہ بالکل اپنے مشیروں کے ہاتھ میں ہیں۔ آج کی ملاقات میں مجھے یقین ہو گیا کہ یہ سچ ہے سوائے اس کے کہ پرنس مکرم جاہ کے متعلق تو انہوں نے کہا کہ اچھا ہو کہ وہ بورڈنگ میں رہیں باقی تمام باتوں پر مثلاً انکم ٹیکس اور انفلیشن یا ڈپریشن کا اثر بلا زبان سرکار پر۔ ریاستوں کا مستقبل اور معاہدوں کے تحت مستقبل میں حفاظت۔ ایسی چیزوں پر وہ نوٹ لکھتے رہے مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ مجھے اُن سے بارہا ملنے کا موقعہ ہوا۔ میرے خیال میں وہ ایک زبردست جنرل تھے وہ سیدھی اور صاف باتیں پسند کرتے تھے۔ سیاسی جوڑ توڑ اور پیچیدہ باتیں۔ کہا سنائی۔ کجا جی زنی انہیں پسند نہ تھی۔ مجھے یاد ہے اور اس زمانہ کے تذکرہ نویسوں نے اسے لکھا ہے کہ وہ کہا تھا گاندھی جی۔ مسٹر جناح اور دوسرے سیاسی لیڈروں سے کہتے تھے کہ وہ ایک سپاہی تھے اور سیاسی پیچ و خم اُن کی سمجھ میں نہیں آتے۔

اُسی زمانہ میں کاظم یار جنگ میرے پاس آئے اور کہا کہ سرکار نے ایک خط ریزیڈنٹ کو لکھا ہے کہ عبداللہ خاں کسمنڈی جن کا گذشتہ زمانہ میں حیدرآباد سے اخراج کیا گیا تھا۔ انہیں اور ظفر علی خاں کو پھر آنے کی اجازت ہو۔ اُن کا یہ خیال تھا کہ اسے روکا جائے میرے پاس ریزیڈنسی سے سرکار کے خط کی نقل اور جو ریزیڈنٹ نے جواب دیا وہ پہلے ہی آ چکا تھا۔ میں خاموش ہو گیا۔ عبداللہ خاں کسمنڈی نے مجھے بھی ایک خط لکھا تھا جس کی نقل سرکار کو بھی بھیجی تھی۔ میں نے اس کا ایک مختصر جواب دیدیا۔

۱۲ جون ۱۹۴۲ء کو میں اوٹی پہاڑ پر گیا۔ ریزیڈنٹ کے پاس مقیم

دل کی حرکت بند ہوگئی۔ مجھے ان کے انتقال کا افسوس ہوا بڑے اچھے معاملہ فہم تھے۔ حیدرآباد میں عموماً اور وہاں کے مسلمانوں پر خصوصاً ان کا بہت اثر تھا۔ میں صبح کو اُن کے مکان پر تعزیت کے واسطے گیا۔ اُسی وقت سرکار بھی تشریف لائے۔ تجہیز و تکفین میں شریک ہوا۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ پھر اعلیٰ حضرت کے پاس حاضر ہوا۔ مجھے زین یار جنگ سے سرکار کے خیالات معلوم ہو چکے تھے۔ سرکار نے فرمایا کہ بتائیے تمہاری رائے ان کی موت کے متعلق کیا ہے۔ میں نے کہا کہ ان کے انتقال سے سرکار کا ایک بڑا خادم اُٹھ گیا۔ لیکن خدا کا کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ فرمایا ان کے عروج سے ضرور فتنہ کا اندیشہ تھا بعدہٗ اور کچھ مرحوم کے متعلق فرماتے رہے۔ ۳۰ جون کو جب میں ریذیڈنٹ سے ملا تو ریذیڈنٹ نے بھی بہادر یار جنگ کے انتقال کے متعلق وہی خیالات ظاہر کئے کہ جو نظام کے تھے۔ انہوں نے کہا ذاتی طور سے مجھے افسوس ہے لیکن یہاں کے اسٹیٹ کے پیش نظر یہ بُرا نہ ہوا۔ ||

۲ جولائی ۱۹۴۴ء آج حکیم مقصود علی خاں جو سرکار کے طبیب خاص تھے ایک نجی خط بیوہ بہادر یار جنگ کا لائے جس میں مرحوم کی موت کی وجہ پر اشتباہ کیا گیا تھا اور یہ خواہش کی گئی تھی کہ مرحوم کی جاگیر تا حیات اُن کے نام کر دی جائے۔ گو یہ پرائیویٹ خط تھا مگر چونکہ زہر خورانی کا شبہ کیا گیا تھا میں نے پولیس ممبر گرگس اور رائینڈرس ناظم پولیس کو بتایا کہ وہ اس نقطہ نظر سے دیکھیں۔ اُسی روز علی یاور جنگ میرے یہاں لنچ پر آئے اور کہا کہ جس زمانہ میں ہم لوگ حیدرآباد سے باہر تھے یہاں کسی بڑی سازش کی عام خبر پھیلی تھی اور انہوں نے ناظم پولیس سے اس کا ذکر کیا تھا میں نے ناظم پولیس سے دریافت کیا تو اس نے کہا کہ علی یاور جنگ نے ذکر کیا تھا مگر ناظم پولیس کو اس کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ ہر شخص نے بھی مجھ سے کہا

بہادر یار جنگ کے ذریعہ سے کوئی گہری سازش ہونے والی تھی ان حضرات کا منشاء یہ تھا کہ غلام محمد اور بہادر یار جنگ مل کر کوئی سازش میرے خلاف کرنے والے تھے۔ واللہ اعلم۔ ||

نواب علی نواز جنگ کی شخصیت بھی ایسی تھی کہ حیدرآباد کی کہانی نامکمل رہے اگر ان کا ذکر نہ ہو۔ یہ ایک وظیفہ یاب انجینیر تھے مزاج بہت تیز تھا۔ لیکن اپنے فن کے اعتبار سے اُنہیں بڑے پایہ کا انجینیر خیال کیا جاتا تھا ان کی قابلیت کا یقین مجھے اس سے ہوا کہ میرے ایک دوست سر ولیم اسٹیمپ جو یو۔پی سے چیف انجینیری سے ریٹائر ہوئے تھے اور اس زمانہ میں حکومت ہند نے اُنہیں مشیر کی حیثیت سے بھیجا تھا حیدرآباد آئے جہاں تک مجھے یاد ہے اسی تنگبھدرا کے پانی کے قضیہ میں آئے تھے میں نے اُن سے پوچھا کہ یہاں علی نواز جنگ کے بلند پایہ انجینیر ہونے کی بڑی شہرت ہے آپ کا کیا خیال ہے سر ولیم نے کہا کہ

"NAWAB SAHIB, WHAT ALI NAWAZ JUNG DOES NOT KNOW IN ENGINEERING IS NOT WORTH KNOWING."

اس سے اندازہ ہوا کہ اُن کا فنی اعتبار سے کیا مرتبہ تھا۔

۵ اگست ۱۹۴۴ء دہلی سے واپسی پر سرکار میں حاضر ہوا۔ وہاں کی کہانی دہرائی جس میں خاص بات یہ تھی کہ برٹش گورنمنٹ سکندرآباد کے لوگوں پر انکم ٹیکس لگانا چاہتی تھی دوسرے یہ کہ ہمارے کارخانوں سے جو برٹش انڈیا میں چیزیں خریدی جائیں اُن کی قیمت برٹش انڈیا میں ادا ہو مطلب یہ تھا کہ آمدنی کسی شخص کو اگر برٹش انڈیا میں ہوگی تو وہاں کا ٹیکس لگانے کا حق بھی برٹش گورنمنٹ کو ہوگا۔ حیدرآباد کی حکومت اس کی مخالف تھی میرا استدلال یہ تھا کہ سکندرآباد کی ملکیت برٹش گورنمنٹ کی نہیں ہے فقط فوج رکھنے کا حق دیا ہے۔ ورنہ ہم وزیر ہند کو اپیل کریں گے۔